Monthly
Arxang
Lahore

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 25واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

مدیرِ اعلیٰ:
عامر بن علی

علامہ محمد اقبال

(09 November 1877 - 21 April 1938)

مدیران:
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

بیا کہ ساقی گلچہرہ دست بر چنگ است
چمن ز باد بہاران جواب ارژنگ است

نومبر ۲۰۲۴ء

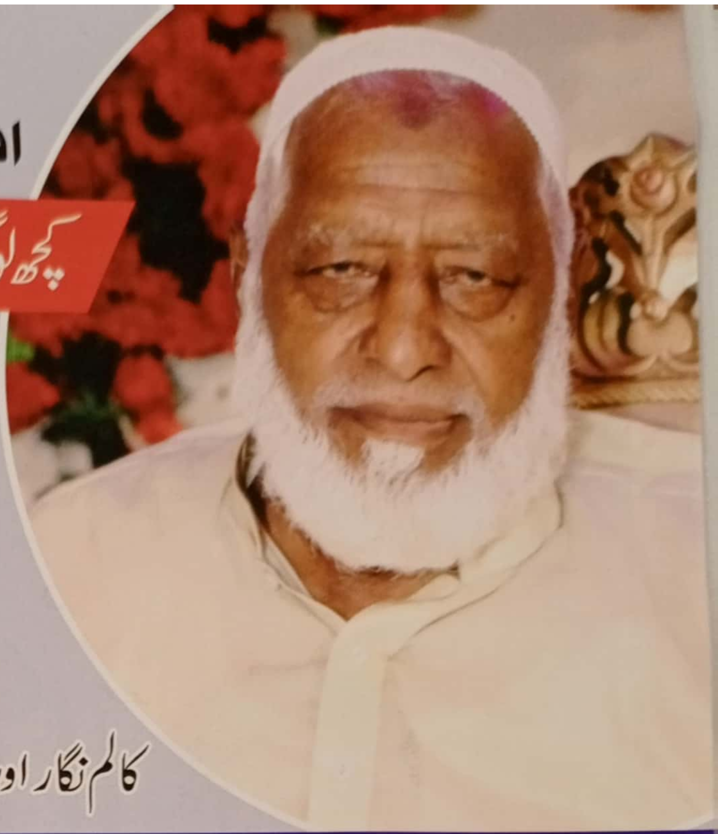

ادب میں مشاعرے کا کردار لافانی ہے

کچھ لوگوں نے سوشل میڈیا پر ادب کو مذاق بنا دیا ہے

نامور شاعر، ادیب، دانشور

حنیف صوفی

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کی خصوصی گفتگو

بزرگ شعراء، ادباء اور اہل قلم سے دوستانہ تعلق میری زندگی کا سرمایہ ہے

حنیف صوفی کی تمام زندگی شعروسخن کی ترویج میں بسر ہوئی ہے۔وہ باکمال فی البدیع شاعر ہیں۔ صاحب دیوان مقبول شاعر ہونے کے علاوہ ان کا ایک امتیازی تعارف یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مشاعرے منعقد کروائے۔بورے والا میں مشاعرے کی توانا روایت انہی کی مرہون منت ہے۔ احمد فراز، قاسمی صاحب، منیر نیازی اور امجد اسلام امجد جیسے لوگ ان کے ایک بلاوے پر پہنچ جاتے تھے۔ہمارے وطن میں چند لوگ ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے شعروادب سے اس قدر والہانہ عشق کیا ہے۔میری خوش قسمتی کہ وہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر میاں چنوں ملاقات کے لئے میرے گھر تشریف لائے۔ان کے ہمراہ ان کے سخنور اور سخن شناس برخوردار صفیان سیفی اور پوتے بھی تشریف لائے۔ یہ دیکھ کر خوشی اور طمانیت محسوس ہوئی کہ وہ ادب کو ذریعہ عزت خیال کرتے ہوئے اسے اگلی نسلوں کو منتقل کرنے کے قائل ہیں۔ان سے ہونے والی گفتگو قارئین ارژنگ کی نذر ہے۔

س:۔بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

ج:۔میری پیدائش بورے والا کے علاقہ ڈی بلاک میں ہوئی۔ میں نے دینی اور دنیاوی تعلیم مدرسہ عربیہ اسلامیہ بورے والا میں حاصل کی۔ میرے والد صاحب بلدیہ بورے والا کے ٹھیکیدار تھے۔

س:۔ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج:۔ مجھے بچپن سے ہی مشاعرے سننے کا شوق تھا۔ 1968 میں ایم سی ہائی سکول بورے والا میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔جس میں ملک کے نامور شعراء کرام نے شرکت کی۔اس مشاعرے میں ملک کے نامور شاعر جناب بری نظامی صاحب نے بھی شرکت کی۔ بری نظامی کا تعلق بھی ٹرانسپورٹ سے تھا۔ان دنوں میں بھی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا ملازم تھا۔میرے خیال میں یہ وہ موقع تھا جب میں نے ادب کی راہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔میں نے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے محترم جناب پروفیسر منشاء سلیمی صاحب کی باقاعدہ شاگردی اختیار کر لی۔

س:۔اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

میری پہلی کتاب پنجابی میں ''کنڈیاں چوں خوشبو'' کے نام سے تھی۔جس کا پہلا ایڈیشن سن 1992 اور دوسرا ایڈیشن 1994 میں چھپا۔

س:۔کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے؟

ج:۔سن 1972 میں بورے والا ایک ادبی تنظیم مجلس میاں محمد بخش رحمت اللہ علیہ بورے والا کے نام سے قائم ہوئی جو کہ حضرت میاں محمد بخش کے نام سے منسوب تھی۔ عرصہ تقریباً دوسال کے بعد ہی میں مجلس میاں محمد بخش کا صدر منتخب ہوا۔تب سے لے کر اب تک مجلس میاں محمد بخش کے زیراہتمام سینکڑوں مشاعرے آج تک منعقد کرو چکا ہوں۔جس میں پاکستان کے بہت بڑے بڑے شعراء کرام نے شرکت کی۔

س:۔کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج:۔الیکٹرانک میڈیا نے نوجوان نسل کو اپنی طرف متوجہ کیا تو اس میں شاعری بھی شامل تھی۔جس کی وجہ سے نوجوان نسل کا ذہن تقسیم ہوگیا۔جس کی وجہ سے مشاعروں میں بھی کمی نظر آنے لگی اور لوگوں نے موبائل کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور ادبی سرگرمیاں کتاب سے دور ہوتی چلی گئیں۔

س:۔تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج:۔تخلیقیت اور ایک اچھے تخلیق کار سے مراد ہے کہ اپنی محنت اور اللہ سے عطاء کی ہوئی زندہ رہنے والی تخلیق ہوتی ہے۔اچھا شعر وہ ہوتا ہے جس کو سننے والوں کو یاد کرنے میں دشواری نہ ہو۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِاہتمام مسلسل اشاعت کا 25واں سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

MONTHLY Arzang LAHORE

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

نومبر 2024ء شمارہ 11

مدیر اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
- سعدیہ سیٹھی

مجلسِ مشاورت
- ظفر خان (آسٹریلیا)
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط وکتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ ''ارژنگ'' کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت 2

مضامین:
- اقبال کا پیغام، اقوامِ مشرق کے نام / پروفیسر فتح محمد ملک ' 4
- گمنام مجاہد۔ بابا احمد دین غازی / جسٹس (ر) میاں نذیر اختر ' 6
- کشتۂ شمع رسالت سیدنا بلال ؓ / تفاخر محمود گوندل ' 9
- ''گجل'' اُردو شاعری میں نئی صنفِ سخن / سرور عالم راز سرور ' 15

شعری گوشے: نسیمِ سحر ' ڈاکٹر نواز کاوش 18 تا 19

مضامین:
- تری خالی جگہ کو بھر رہے ہیں / فرحت احساس (انڈیا) ' 20
- علامہ محمد اسد / فقیر اللہ خان ' 24
- خواہ مخواہ کے شعری اوزان / احمد ندیم رفیع ' 28
- تعلیم سے بہتر تربیت / بوٹا انجم ' 29
- عامر بن علی۔ ہمہ جہت شخصیت / روبینہ شہادت ' 30
- محبت کا استعارہ اور لبنیٰ صفدر / عبدالوحید بسمل ' 31
- ''غزل گو'' کی شاعری / امجد علی ' 33

افسانے:
- گہر / وسیم گوہر / مترجم: سلیم شہزاد ' 35
- آخری سانس کا پھول / انجینئر ظفر محی الدین ' 36
- سرخ دھبہ / انور ظہیر رہبر ' 37
- کوڈو / صفدر ناظر ' 39
- نیلو نیل / پروفیسر نور کمال شاہ ' 41

بقیہ انٹرویو: حنیف صوفی ' 43

بقیہ انٹرویو: تفاخر محمود گوندل ' 44

سفرنامے:
- اس بلا سے نجات ممکن ہے / عامر بن علی ' 46
- مسقط۔ دو ہزار روپے سے شروع ہونے والا سفر / قرۃ العین حیدر ' 47
- سعودی عرب، اُردن، فلسطین اور اسرائیل کے سفر / عمران محسن ' 49
- مین ازاے سوشل میڈیا اینیمل / امجد محمود چشتی ' 50
- سندھ کی لوک کہانیاں / مرزا کاظم رضا بیگ ' 52
- ڈاکٹر شمیم آزر کی کتاب ''خواب خواب اندیشے'' کی تقریب رونمائی / رپورٹ: سکندر ابوالخیر ' 55
- شعری گوشے: ذکی احمد شاہین ، احمد عدنان طارق 56 تا 57
- جاپان کا بڑھاپا اور اکیلا پن / شہزاد علی بہلم ' 58
- ادبی خبریں ' 60

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد باری تعالیٰ

اسی کے کون و مکاں لا الٰہ الا اللہ
کہ لامکاں ہے کہاں لا الٰہ الا اللہ
سراپا حُسن ہے اس کا جمال کیا کہنا
ہر ایک رخ سے عیاں لا الٰہ الا اللہ
وہ بحر و بر ہو، وہ دشت و جبل کہ صحنِ چمن
فضا میں گونجی اذاں لا الٰہ الا اللہ
اسی سے لَو جو لگی ہو تو اختیار کہاں
پکارتی ہے زباں لا الٰہ الا اللہ
وہ ایک لمحہ کہ لحظہ ہو یا ہو وقتِ سحر
سبھی ہیں اس کے زماں لا الٰہ الا اللہ
شہید راہِ خدا کی طلب ہے عین حیات
صدائے تشنہ دہاں لا الٰہ الا اللہ
شکستہ دل میں وہ خوشبو مثال آ بیٹھا
یہاں بھی ہے وہ نہاں لا الٰہ الا اللہ

حسن عسکری کاظمی/لاہور

خُدا ہے کافی، خُدا ہے شافی
لگا کے رکھیں اُسی سے یاری
رضا اُسی کی جُھکائے رکھے
ہر آن رکھیں اُسی کو راضی
خیال اُس کا سرُور بخشے
دما دم اُس کا نشہ ہو طاری
بُھلا کے اُس کو جو خُوش گماں ہے
ہر ایک بازی اُسی نے ہاری
چہار جانب اُسی کی قُدرت
اُسی کا پَلّہ ہے سب پہ بھاری
یہ حرفِ کُن کا ہے کارنامہ
جو ہر نفَس میں ہے جاری ساری
پہاڑ توڑے غموں کے اُس نے
اُسی کی کام آئی ضربِ کاری
ریاضؔ یہ ہے اُسی کو سوچوں
جو اُلجھنیں دور کر دے ساری

سیّد ریاض حسین زیدی/لاہور

ان جانے سے خواب دکھاتے رہتے ہو
مجھ کو اطمینان دلاتے رہتے ہو
کہنے کو ہو پاس مگر ہو دور بہت
شامل ہو کر بھی ترساتے رہتے ہو
ایسے ہی لگ جاؤ کسی دن ہاتھ کہیں
جیسے تم احساس میں آتے رہتے ہو
کیا میں تم کو اتنا پیارا لگتا ہوں
جب دیکھو تب پیار جتاتے رہتے ہو
بخشش کا ماحول بناتے ہی اُس کا
میری جانب رُخ فرماتے رہتے ہو
اپنی راہ لگا لیتے ہو لمحوں میں
لالچ دے کر جی للچاتے رہتے ہو
دن بھر چین نہیں لینے دیتے ہو اور
ساری ساری رات جگاتے رہتے ہو
خود ہی کر دیتے ہو غافل خود سے بھی
خود ہی خود سے بھی ملواتے رہتے ہو
جل تھل کر دینے کے شوق میں صحرا پر
بادل بن کے کیوں منڈلاتے رہتے ہو
جب چاہو بے آب رکھو دل دھرتی کو
جب چاہو بارش برساتے رہتے ہو
خود ہی چھپ جاتے ہو اپنی جانب سے
خود ہی خود کے ناز اُٹھاتے رہتے ہو
اُس کی یاد سے خالی لمحوں کا آکاشؔ
کاندھوں پر کیوں بوجھ اُٹھاتے رہتے ہو

احمد سبحانی آکاش/لاہور

وہ عدو ہے کہ یار صاحب کا
ہر کوئی زیر بار صاحب کا
ایک صندوق موتیوں سے بھرا
جب بھی کھولا انار صاحب کا
پھول نکلا ہے میرا اُنگلی سے
جب بھی توڑا ہے خار صاحب کا
بے قراری ہے کائنات میں کیوں
کس نے لوٹا قرار صاحب کا
لاوا آتش فشاں نے اُگلا ہے
کچھ تو نکلا غبار صاحب کا
آنسوؤں کی زباں ہے سرکاری
نام رو کر پکار صاحب کا
جتنا کر سکتا ہے تماشا کر
وقت اچھا گزار صاحب کا
دکھ سے اتنا بھرا ہوا ہوں میں
کیسے جھیلوں گا پیار صاحب کا
آخری جانے کون ہوتا ہے
میں ہوں پہلا شکار صاحب کا

حسن عباسی/لاہور

نعت رسولِ مقبول ﷺ

ذکرِ نبیؐ سے دل مرا معمور ہو گیا
ذکرِ نبیؐ ہی اب مرا دستور ہو گیا
صد شکر ہوں نگاہِ رسولؐ کریم میں
طیبہ سے لوٹ کے بھی کہاں دور ہو گیا
سائے غموں کے دور ہوئے اور میرا دل
نورِ درودِ پاک سے پُر نور ہو گیا
آداب کا خیال رہے بزمِ نعت میں
جو بے ادب ہے رحمتوں سے دور ہو گیا
انؐ کے کرم سے اذنِ حضوری ملا مجھے
آنا حرم میں پھر مرا منظور ہو گیا
ہجرِ نبی میں اشک بہانا ہوا قبول
طیبہ کی رحمتیں مرا مقدور ہو گیا
یہ بھی تو فیضِ ذکرِ رسالت مآب ہے
حجرہ نشین مجھ سا بھی مشہور ہو گیا
رہتا تھا پہلے غمزدہ اخترؔ کبھی کبھی
ذکرِ نبیؐ پاک سے مسرور ہو گیا

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

مدینہ میں قیام کا آخری دن

ہوتا ہوں جدا آج نبی پاکؐ کے در سے
اس شام چلا جاؤں گا سرکارؐ کے گھر سے
کر دینا معاف آقاؐ تفاخر کی خطائیں
سرزد جو ہوئیں ایک خطا کار بشر سے
لے جاؤ نہ ساتھ اپنے مجھے قافلے والو!
مر جاؤں گا اللہ قسم، ہجر کے ڈر سے
بن جاؤں گا جاروب کشِ گنبدِ خضریٰ
ذرّے بھی ہیں خورشید جہاں نورِ سحرؐ سے
کر لیتا تھا ہر رات کو اشکوں سے وضو میں
ہر بوجھ اُتر جاتا تھا آقاؐ کی نظر سے
کیا بات ہے اے مسکنِ خورشیدِ رسالتؐ
آتی ہے مہک تیری ہر اک راہ گزر سے
صد شکر کہ ہے دیکھ لیا گنبدِ خضریٰ
اک عمر مرے قلب و نظر دید کو ترسے
لیتے ہیں شب و روز کہاں سے یہ تجلی
جا پوچھ لے رخشندگیِ شمس و قمر سے
دیدار کی دولت تو عطا خیر ہوئی ہے
جاتا رہا یرقان بھی زم زم کے اثر سے
پلکوں نے ترے نقشِ قدم چوم لیے ہیں
نکلا تھا تفاخر تو یہی سوچ کے گھر سے

تفاخر محمود گوندل/جھیوراں والی

جو میرے دل کی ٹہنی پر کھلا ہے
خوشا وہ نام، نامِ مصطفیٰؐ ہے
ابھی چوما ہے میں نے نام اُنؐ کا
مرا سارا بدن مہکا ہوا ہے
مجھے آتی ہے جب بھی یاد اُنؐ کی
سرِ مژگاں ستارا جاگتا ہے
یہ ہے اعجاز اسمِ مصطفیٰؐ کا
جہاں بھر میں اُجالا ہو گیا ہے
وہ دل جس میں مرے آقا بسے ہیں
وہ دل اب دل نہیں، غارِ حرا ہے
میں اُنؐ کے نام پر جاں دے رہا ہوں
یہ عشقِ مصطفیٰؐ کی ابتدا ہے
لیا ہے میں نے جب بھی نام اُنؐ کا
مرا ہر غم خوشی میں ڈھل گیا ہے
کہے ایوبؔ! کیوں اب دل کی حاجت
اُنھیںؐ معلوم ہے کیا مانگتا ہے

ڈاکٹر ایوب ندیم/لاہور

(نعت شریف صنعت غیر منقوطہ میں)

دلوں کے در کرے ہے وا
کہا مرے رسولؐ کا
رواں دواں ہے سلسلہ
کرم کرم عطا عطا
درِ رسولؐ کا گدا
کہے ہے دل رہوں سدا
ملے کہاں سے آگہی
درِ رسولؐ کے سوا
ہو مرحلہ گراں اگر
کرم کا ہے اک آسرا
وہاں کہاں عطا کی حد
لگائے دل کوئی صدا
دلوں کا اک سرور ہے
وہ کوہ کی ہوا حرا!
کہا، کوئے رسولؐ کا
اُڑا کے لے گئی ہوا

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

کیا کم یہ کرم مجھ پہ شہِ سرورِ دیںؐ ہے
ہے جسم یہاں، روح مدینے کی مکیں ہے
دلکش ہیں بہت یوں تو زمانے کے نظارے
منظر نہ کوئی گنبدِ خضرا سے حسیں ہے
ممکن ہے کہاں سرورِ عالمؐ کا مماثل
اللہ نے جب اور بنایا ہی نہیں ہے
اللہ غنی آپؐ کے کردار کی عظمت
دشمن بھی کہے آپ کو صادق ہے، امیں ہے
یہ در ہے جہاں دل کبھی توڑے نہیں جاتے
محرومِ تمنا کوئی دیکھا ہی نہیں ہے
ہے رشکِ فلک، رشکِ اِرم، رشکِ ملائک
کونین کا جھومر ہے، وہ طیبہ کی زمیں ہے
اس شان سے مبعوث کیا ان کو خدا نے
ہر شے کو کیا آپؐ کے بس زیرِ نگیں ہے
آتا نہیں خالی کوئی منگتا کبھی در سے
اک لفظ نہیں آپؐ کے جو لب پہ نہیں ہے
آ جا اے اجل دیر نہ کر، آج کرم ہے
جاوید کی سرکارؐ کے قدموں میں جبیں ہے

جاوید منظور/لاہور

اقبال کا پیغام، اقوامِ مشرق کے نام

پروفیسر فتح محمد ملک/اسلام آباد

علامہ اقبالؒ نے اپنی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' آج سے ۸۳ برس پیشتر لکھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عالمِ مشرق غلامی کی تہ در تہ تاریکیوں میں محوِ خواب تھا۔ علامہ اقبال نے اپنی اس نظم میں مشرق کی آزادی کی بشارت دی تھی:

پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق
باز روشن می شود ایامِ شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید

اقبال ایک مدت سے اقوامِ مشرق کی بیداری کے ساز پر نغمہ سنج چلے آرہے تھے مگر دُنیائے اسلام تب بھی میر وسلطاں کے پنجۂ استبداد میں اسیر تھی اور اب بھی ہے۔ اقبال یہ شعور عام کرنے میں مصروف تھے کہ:

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پُرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

مگر دُنیائے اسلام بدستور میر وسلطاں کی چاکری کو عبادت کا درجہ دینے میں منہمک تھی۔ اقبال نے مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' میں عالمِ مشرق کو مغربی استعمار کے پنجۂ استبداد سے آزادی کے بعد اپنی سیاسی اور روحانی زندگی کی تعمیرِ نو کا ایک نیا اور انقلابی نصب العین پیش کیا تھا۔ غلامی نے دین اور سیاست کا مفہوم بدل کر رکھ دیا تھا۔ دنیائے اسلام حکمتِ کلیمی کو فراموش کر کے حکمتِ فرعونی کے زیرِ اثر قوتِ فرمانروا کی پرستش کو کارِ ثواب سمجھنے لگی تھی۔ نوبت یہاں آ پہنچی تھی کہ:

شیخِ او لُردِ فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقامِ بایزید
گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانے از خودی محرومی است
دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مرد
عصر ما مارا زما بیگانہ کرد
از جمالِ مصطفیٰ بیگانہ کرد

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اپنی اس مثنوی میں علامہ اقبال نے دنیائے اسلام یا دنیائے شرق کی بجائے اقوامِ شرق کی اصطلاح کیوں استعمال کی ہے؟ اس لیے کہ دنیا اُس وقت امپیریلزم کی بجائے نیشنلزم کے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ دنیائے اسلام بے شک ابھی تک خلافت کے نام پر ملوکیت کی گرفت میں پڑی سسکتی تھی مگر اقبال کی نگاہ مستقبل کے تقاضوں پر مرکوز تھی اور دل روحانی جمہوریت کے خیر مقدم کو بے تاب تھا۔ اس مثنوی کی تخلیق سے چودہ پندرہ برس پیشتر اقبال اپنے فلسفیانہ خطبات میں ''مسلم لیگ آف نیشنز'' کا تصور پیش کر چکے تھے۔ چنانچہ زیرِ نظر نظم میں اُنھوں نے ملتِ اسلامیہ کی بجائے اقوامِ مشرق کو مخاطب کیا ہے۔ اپنے The Principal of Movement in the Structure of Islam کے عنوان سے اپنے خطبے میں مسلم لیگ آف نیشنز کا تصور پیش کیا تھا۔ اس باب میں اُن کا استدلال پیشِ خدمت ہے:

"For the present every Muslim nation must sink into her town deeper self, temporarily focus here vision on herself alone, untill all are strong and powerful to form a living family of republics. A true and living unity, according to the nationalist thinkers, is not so easy as to be achieved by a merely symbolical overlordships. It is truly manifested in a multiplicity of free independent units whose racial rivalries as adjusted and harmonized by he unifying bond of a common spiritual. It seems to me that God is slowly bringing home to us the truth that Islam is neither Nationalism nor Imperialism but a League of Nations which recognizes artificial boundaries and racial distinctions for facility of reference only, and not for restricting the social horizon of its members."1

مفکرِ اسلام اور مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے قیامِ پاکستان سے ۱۱برس پیشتر ہی پورے مشرق کو آزادی کی بشارت دے دی تھی۔ اپنی اِس نظم میں انھوں نے سیاسی آزادی کے طلوع کے ساتھ ہی تہذیبی آزادی کی منزل تک کی راہوں کی نشاندہی کر دی تھی۔ اِن راہوں پر برق رفتاری کے ساتھ سفر کی پہلی شرط یہ بتائی تھی کہ: 'مومنِ خود، کافرِ افرنگ شوٗ۔ فرنگ یعنی مغربی استعمار کی غلامی سے انکار سچی آزادی کی جانب پہلا قدم ہے۔ اقبال اُپنے مشاہدہ اور تخیل کی روشنی میں دورِ غلامی کی میراث کو نئی تعمیر کی راہ کی سب سے بڑی رُکاوٹ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی اِس طویل نظم میں غلامی کے آثار کی نشان دہی بھی کی

اور اِن آثار کو مٹا کر بندگانِ آزاد کے فکر وعمل کی درخشندہ روایات کو بھی تازہ کیا ہے۔ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جس تجارتی سیاسی کلچر کو جنم دیا اور برطانوی حکمرانوں نے جسے پروان چڑھایا تھا اُس کی رُو سے دُکان کا تھڑا اور تختِ حکومت یک جا کر دیے گئے تھے۔ اِن تاجر حکمرانوں سے نجات کی آرزو میں اقبال اہلِ سیاست کو خبردار کرتے ہیں کہ:

دانی از افرنگ و ازکارِ فرنگ
تا کجا در قید زُنارِ فرنگ
زخم ازو نشتر ازو، سوزن ازو
ما و جوے خون و امید رفو
خود بدانی پادشاہی قاہری است
قاہری در عصر ما سوداگری است
تختۂ دکان شریکِ تخت و تاج
از تجارت نفع و از شاہی خراج
آن جہانبانے کہ ہم سوداگر است
بر زبانش خیر و اندر دل شر است

خودانحصاری ہی سے اِس تاجرانہ سیاسی کلچر سے نجات ممکن ہے۔ مشرق کی سیاسی آزادی کے آثار دیکھتے ہوئے اقبال مشرق کی قوموں کو ذہنی غلامی ترک کر کے خود اپنے وسائل پر انحصار اور اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرنے کا چلن اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبال اِس سرمایہ دارانہ سیاسی کلچر کے ردِعمل میں نمودار ہونے والے اشترا کی انقلاب کا خیر مقدم کرتے ہیں:

ہمچناں بینی کہ در دور فرنگ
بندگی با خواجگی آمد بہ جنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آن نظام کہنہ را برہم ز داست
تیز نیشی بر رگِ عالم ز داست
کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطین، لاکلیسا، لا الہ

اقبال اپنے فلسفۂ ارتقا کی روشنی میں اشترا کی نظام لا کے مقامِ نفی سے اِلّا اللہ کے مقامِ اثبات کی جانب اپنا سفر جاری رکھے گا مگر افسوس کہ یہ نظام مقامِ لا پر ہی رُک کر ناکامی سے دوچار ہو گیا۔ وجہ یہ کہ:

در مقام لا نیا ساید حیات
سوی اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا سازو برگِ اُمتاں
نفی بی اثبات ، مرگِ اُمتاں

لا و اِلّا کی اسی صداقت کی روشنی میں اقبال اپنی اِس مثنوی میں اسلام کے بنیادی تصورات کی تشریح و تعبیر کرتے ہیں۔ اِن میں لا الہ الا اللہ، فقر، مردِ حُر کے ساتھ ساتھ اسرارِ شریعت، اسرارِ طریقت شامل ہیں۔ اسرارِ شریعت پر روشنی ڈالتے وقت اپنی تان اِس بات پر توڑتے ہیں: ''کس نباشد در جہاں محتاجِ کس/ نکتۂ شرعِ مبین این است بس''۔ اور طریقت کو اسرارِ شریعت دل و جاں میں بسا دینے کا نام دیتے ہیں: ''پس طریقت چیست اے والا صفات/ شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات''۔ اقبال اسی طرح اسلام کے بنیادی تصورات کو مُلائیت اور ملوکیت کی گرد سے پاک کر کے اُن کی حقیقی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی پیش بینی سے اِس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح دیکھ لیتے ہیں کہ اب مشرق سے مغرب کا سامراجی غلبہ ٹوٹنے کو ہے۔ وہ اِس اندیشے میں مبتلا ہیں کہ کہیں مغربی سامراج کی براہِ راست غلامی کے چُنگل سے رہائی کے بعد مشرق مغرب کے مقلد سیاستدانوں کی گرفت میں پڑا سسکتا نہ رہے۔ چنانچہ وہ مشرق کی حقیقی آزادی کا منظوم منشور پیش کرتے ہیں۔ ہمارے حکمران طبقے نے اب تک اِس منشور کو نہ پڑھا ہے نہ سمجھا ہے اور نہ ہی اِس سوال پر غور کیا ہے کہ سیاسی آزادی کو حقیقی آزادی بنانے کی خاطر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اقبال نے مشرق کی قوموں سے ۱۹۳۶ء میں جو سوال کیا تھا وہ ہنوز اپنے جواب کو ترس رہا ہے۔ مثنوی کے آخر میں اقبال نے حضورِ اکرم کی بارگاہ میں بھی اِس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ:

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب
ایں غلام ابن غلام ابنِ غلام
حریت اندیشۂ اُو را حرام
مکتب از وی جذبۂ دیں در رمود
از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
ایں ز خود بیگانہ این مستِ فرنگ
نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ
ما ہمہ افسونیِ تہذیبِ غرب
کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب
آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ

افسوس کہ مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے اقوامِ مشرق کی حقیقی آزادی کا جو منشور پیش کیا تھا وہ ہمارے ہاں آج بھی رُوبہ عمل آنے کو ترس رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بھی اقبال ہی کے لفظوں میں ہماری غلام ابنِ غلام ابنِ غلام قیادت ہے۔ اقبال سچ کہتے تھے کہ حقیقی آزادی اس غلامانہ ذہنیت سے آزادی کے بغیر ناممکن ہے!

حواشی:

1. The Reconstruction of Religious Thought, Allama Muhammad Iqbal, Lahore, 3rd edition, 1996, p.126.

گمنام مجاہد۔ بابا احمد دین غازی

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

مصنف: سابق جج لاہور ہائیکورٹ لاہور۔ سابق ممبر اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان۔ سابق امین پنجاب بیت المال۔ سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی لاکالج لاہور

تاریخ کے اوراق بے شمار عظیم مجاہدوں، غازیوں اور شہیدوں کے ناموں سے جگمگا رہے ہیں۔ بعض ہستیوں کے واقعات تفصیل سے جمع کیے گئے اور بعض کے مختصر حالات ملتے ہیں۔ احمد دین غازی کے حالات کم کم دستیاب ہیں۔ آج سے تقریباً 25 برس قبل ان کے بارے میں عاطف محمود سبزواری کا مضمون اخبار ''خبریں'' میں 18 جولائی 1999ء کو چھپا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد اخبارات اور رسائل میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ حال ہی میں راقم کی ملاقات محترم انتظار علی صاحب سے ہوئی جن سے راقم کو پہلی بار احمد دین غازی کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی ملاقاتیں غازی صاحب سے 1990ء سے 1995ء کے دوران ہوتی رہیں اور انہوں نے ان سے براہِ راست ان کے اس کارنامے کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں جس میں غازی صاحب نے علاقہ راجہ جنگ کے ایک سِکھ ویدا سنگھ کو اس بنا پر ختم کر دیا تھا کہ اس نے اُس علاقے میں مسلمانوں کی مساجد میں اذانیں بند کروائی تھیں۔

محترم انتظار علی کے مطابق غازی صاحب چھریرے لیکن مضبوط بدن کے مالک تھے۔ ان کی پیدائش اغلباً 1909ء میں ہوئی۔ انہوں نے 1929ء میں غازی علم الدین شہیدؒ کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً 20 برس تھی۔ جنازے میں زبردست اژدہام تھا۔ لاکھوں مسلمان جوش وخروش سے نعرے لگا رہے تھے۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ وہ جنازے کو کندھا دے سکے۔ غازی علم الدین کی چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھ دیئے گئے تھے، جو لوگ چارپائی تک نہیں پہنچ سکتے تھے، وہ ان بانسوں کو سہارا دے کر اپنی دلی آرزو پوری کر لیتے۔ غازی احمد دین نے تہیہ کیا کہ وہ غازی علم الدین کی چارپائی تک پہنچ کر کندھا دیں گے۔ وہ لوگوں کے درمیان سے گزرتے گزرتے بالآخر غازی علم الدین کی چارپائی تک پہنچ گئے۔ انہوں نے پنجوں کے بل اُونچا ہو کر اپنے کندھے کو چارپائی تک پہنچا دیا۔ اس سعادت پر وہ بہت خوش وخرم ہوئے۔ اس وقت ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی کوئی ایسا عظیم کارنامہ سرانجام دیں کہ ان کے جنازے میں بھی لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوں۔

غازی احمد دین کا تعلق شاہدرہ کے علاقے سے تھا۔ جوانی کی عمر کو پہنچ کر انہوں نے ریلوے سٹور رائے ونڈ میں بطور ''ہیمر مین'' ملازمت کی، اس وقت سٹور کیپر انتظار علی صاحب کے والد محترم تھے۔ احمد دین غازی ان سے ہی روزانہ ہتھوڑا حاصل کرتے اور کام ختم ہونے کے بعد شام کو واپس سٹور میں جمع کراتے۔ اس کام میں ان کا وجود مزید مضبوط اور توانا ہو گیا۔ آئندہ قدرت نے ان سے ایک اہم کام لینا تھا، شاید اسی کی تیاری کے لیے ان کو جسمانی صحت اور توانائی عطا کی گئی۔ بعد میں غازی صاحب کا خاندان رائے ونڈ کے علاقے میں منتقل ہو گیا۔ اس سے چند کلومیٹر آگے راجہ جنگ کا علاقہ ہے جہاں مسلمان اور سِکھ بڑی تعداد میں آباد تھے۔ ایک دور میں یہ دونوں قومیں امن وامان سے رہتی رہیں لیکن بعد ازاں ان میں اختلافات پیدا ہوئے۔ سِکھوں نے اپنی طاقت اور اثر ورسوخ سے مسلمانوں کی مساجد میں بلند آواز سے اذان دینے پر پابندی لگا دی۔ مسلمانوں نے سِکھوں کے خلاف متعدد مقدمات درج کروائے لیکن ان کے خلاف مناسب قانونی کارروائی نہ ہوئی۔ وہ انگریزوں کا دور تھا جو کہنے کو انصاف پسند کہلاتے تھے لیکن مسلمانوں کے خلاف بہت تعصب برتتے تھے۔ احمد دین غازی کی جوانی کے دور میں راجہ جنگ کے علاقے میں اذانوں پر پابندی کو قائم رکھنے کے لیے ویدا سنگھ نامی سِکھ اور اس کے کچھ ساتھی بہت متحرک تھے۔ ویدا سنگھ یہ دھمکیاں دیا کرتا تھا کہ اگر مسلمانوں کی مساجد میں بلند آواز سے اذانیں دی گئیں تو وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اذان پر یہ پابندی کئی برس تک قائم رہی۔ مسلمان، سکھوں سے گفت وشنید کر کے اور حکامِ بالا سے مل کر اذان پر پابندی کو ختم کرنے کے لیے کاوشیں کرتے رہے لیکن ان کی شنوائی نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ بات احمد دین غازی تک بھی پہنچی۔ وہ سکھوں کی طرف سے مسلمانوں کے مذہبی شعائر میں مداخلت پر بہت دکھی ہوئے لیکن انہوں نے سوچا کہ وہ تنہا تو کچھ نہیں کر سکتے۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ انہوں نے حضرت میاں شیر محمد صاحبؒ شرقپوری کی راہنمائی اور باطنی تصرف کے باعث تنہا یہ کارنامہ سرانجام دیا۔

احمد دین غازی صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ وہ مسلمان صوفیا اور اولیائے کرام کا بہت ادب کرتے تھے۔ وہ اکثر داتا دربار اور لاہور کے کئی اولیائے کرام کے مزارات پر فاتحہ پڑھنے اور دعا کے لیے حاضر ہوتے۔ ایک بار وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے غازی احمد دین اور ان کے ساتھیوں کی خاطر مدارات کی اور انہیں اپنی خصوصی دعاؤں سے نوازا۔ حضرت میاں شیر محمد صاحب کا 20 اگست 1928ء کو وصال ہو گیا۔ احمد دین غازی کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ وہ حضرت میاں شیر محمد صاحب کے مزار پہ حاضر ہوں۔ انہوں نے اپنے دوستوں کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر ایک

نے اپنی اپنی مجبوری کے تحت شرقپور شریف جانے سے معذرت کر لی۔احمد دین غازی کے دل میں حاضری کی آرزو بڑی شدید تھی۔وہ تنہا شرقپور شریف پہنچے اور مزار شریف سے لپٹ کر بہت دیر تک روتے رہے۔اس دوران مغرب کا وقت ہو گیا اور وہ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں چلے گئے۔نماز مغرب ادا کرنے کے بعد انہوں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو دربار پر موجود بزرگوں نے کہا کہ رات کے وقت آپ کا اکیلے سفر کرنا مناسب نہیں، بہتر ہے کہ رات یہیں گزاریں اور صبح کو واپس چلے جائیں۔احمد دین غازی نے کہا کہ پھر مجھے آپ حضرت میاں شیر محمد صاحب کی قبر مبارک کے قریب ہی رات گزارنے کی اجازت دیں۔چنانچہ ان کا بستر مزار شریف کے قریب لگا دیا گیا اور وہ رات کے کھانے اور عشا کی نماز کے بعد وہاں سو گئے۔بقول انتظار علی صاحب خواب میں انہیں حضرت میاں شیر محمد صاحب کی زیارت ہوئی۔انہوں نے احمد دین غازی کو ویدا سنگھ کی صورت دکھائی اور کہا کہ یہ ظالم راجہ جنگ کے علاقے میں مسلمانوں کو مساجد میں اذان نہیں دینے دیتا۔یہ تمہیں راجہ جنگ سے رائے ونڈ کی طرف آتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملے گا، تم ان کے پیچھے ہو جانا تو اللہ تعالیٰ تمہیں موقع فراہم کر دے گا اور تم اسے ختم کر دینا۔صبح بیدار ہونے پر احمد دین غازی کو سارا خواب پوری طرح یاد تھا۔انہوں نے خواب میں دیئے گئے حکم پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک لمبی سی چھری تیار کروائی اور اسے اپنی دھوتی کی ڈب میں چھپا کر رکھ لیا۔انہوں نے رائے ونڈ کے ایک معروف درویش مولوی عطا محمد جیلانی قادری المشہور بابا جی جھنڈے والی سرکار کے پاس حاضر ہو کر دعا کروائی اور اپنی چھری کو بھی دم کروایا۔بابا جی نے چھری دم کر کے غازی احمد دین کو دی اور فرمایا کہ ظالم سکھ اسی چھری سے مارا جائے گا۔(نوٹ: مولوی عطا محمد جیلانی کی ولادت: 1891ء اور وفات 11 مئی 1964 بمطابق 28 ذوالحج 1383ھ کو ہوئی۔ان کی تدفین مسجد غوثیہ رائے ونڈ کے ساتھ ہوئی جہاں ان کا مزار تعمیر کیا گیا)۔

احمد دین غازی نے اپنے جوش وجذبے سے ویدا سنگھ کو اس کی حویلی میں جا کر ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔اس فیصلے کے مطابق وہ راجہ جنگ جا پہنچے جہاں ان کی ملاقات وہاں کے ساکن امام دین سے ہوئی۔انہوں نے اُسے راجہ جنگ میں اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ انہیں اپنے ساتھ لے گیا اور اپنے گھر میں ٹھہرایا۔اس کے بعد امام دین کی اعانت سے، غازی صاحب دو بار رات کی تاریکی میں ویدا سنگھ کی حویلی میں داخل ہوئے لیکن وہ حسب خواہ کارروائی نہ کر پائے۔پہلی بار، رات کے اندھیرے کے باعث وہ نہ جان سکے کہ ویدا سنگھ کس چارپائی پر سویا ہوا ہے، اس لیے وہ لوٹ آئے۔دوسری بار اندر چھلانگ لگانے کے باعث تھوڑی سی آواز سے کچھ اہلِ خانہ بیدار ہو گئے جس سے غازی صاحب فی الفور اندھیرے میں چھپتے چھپاتے باہر آ گئے۔ان دو ادھوری کاوشوں کے بعد غازی صاحب کے دل میں یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ انہیں تو خواب میں راجہ جنگ کے علاقے میں جا کر انتظار کرنے اور ویدا سنگھ کے آنے پر کارروائی کا اشارہ ملا تھا۔اس لیے بعد ازاں وہ خواب میں بتائے ہوئے راجہ جنگ کے علاقے میں ایک نالہ کی پلی کے پاس بیٹھ گئے۔چند گھنٹوں بعد راجہ جنگ کی طرف سے آتے ہوئے تین سکھ نظر آئے، ان میں ویدا سنگھ بہت نمایاں تھا، اس کی صورت دیکھتے ہی غازی احمد دین نے پہچان لیا کہ یہی صورت اُسے خواب میں دکھائی گئی تھی۔یہ تینوں سکھ احمد دین غازی کے پاس سے گزر کر آگے چلے گئے۔احمد دین غازی نے فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کیا۔پہلے وہ پولیس اسٹیشن رائے ونڈ میں گئے۔تقریباً گھنٹہ بھر بعد باہر نکلے اور پھر آگے روانہ ہوئے۔آگے ایک مقام پر دو سکھ، ویدا سنگھ کو وہاں ٹھہرا کر روئی کے کارخانے کے اندر چلے گئے۔اس وقت غازی احمد دین کے دل نے گواہی دی کہ قدرت نے سبب پیدا کر دیا ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ وہ ویدا سنگھ پر ٹوٹ پڑے۔وہ ویدا سنگھ کے قریب پہنچے اور پوچھا کہ تم ویدا سنگھ ہو؟ اس نے کہا، ہاں، میں ہی ویدا سنگھ ہوں۔انہوں نے پھر کہا کہ تم نے ہی مسلمانوں کی مساجد میں اذانیں بند کرائی ہیں؟ اس نے گرج کر جواب دیا، او مسلے، میں نے اذانیں بند کرائی ہیں۔یہ سنتے ہی غازی احمد دین نے کہا کہ اچھا، آج سے اذانیں شروع ہو جائیں گی۔یہ کہتے ہی چھری نکال کر بجلی کی تیزی سے ویدا سنگھ کے پیٹ پر شدید وار کیا جس سے اس کی آنتیں باہر نکل آئیں، اس نے چیخیں بلند کیں، دھڑام سے زمین پر گرا اور تھوڑی دیر بعد مر گیا۔یہ وقوعہ 18 فروری بروز جمعہ 1938ء کو ہوا۔ویدا سنگھ کی چیخیں سن کر اس کے ساتھی اور دیگر متعدد لوگ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔انہوں نے احمد دین غازی کو گھیر لیا۔احمد دین غازی نے بلند آواز سے کہا کہ میں نے ایک سؤر مارا ہے، تم پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ تمہاری بھی خیر نہیں۔یہ کہہ کر وہ ایک سمت آگے بڑھے تو لوگ ڈر کر دائیں بائیں ہٹ گئے۔وہ خون آلود چھری کے ساتھ تھانہ میں پہنچے اور تھانے دار کو کہا ”میں نے ایک سؤر مارا ہے“۔میرے خلاف کارروائی کرو۔تھانیدار مسلمان تھا، اس نے ہمدردی سے کہا کہ احمد دین تم فرار ہو جاؤ۔غازی صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔تھانیدار نے کھانا پیش کیا تو غازی صاحب نے کھانے سے معذرت کر لی۔انہوں نے وضو کر کے شکرانے کے نوافل ادا کیے۔تھوڑی دیر بعد مقتول کا بیٹا سوہن سنگھ اور کئی مشتعل سکھ تھانے میں پہنچ گئے۔انہوں نے غازی صاحب کو چارپائی پر بیٹھے دیکھا تو تھانیدار پر برس پڑے کہ تم نے ایک قاتل کو مہمان بنا کر بٹھایا ہوا ہے۔تھانیدار نے بڑی جرأت سے کہا کہ اس قاتل کو میں اپنے سر پر بٹھاؤں تو بھی کم ہے۔تم ایف آئی آر درج کرواؤ تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔سوہن سنگھ نے ذرا نرم لہجہ اختیار کر کے غازی صاحب کو کہا ”جن پانچ سکھوں کے نام میں تجھے بتاتا ہوں، ان کے نام بھی بطور ملزمان ایف آئی آر میں لکھوا دو“۔یہ

سن کر غازی صاحب نے جواب دیا: ''یہ قتل احمد دین نے کیا ہے اور صرف احمد دین کا نام ہی لکھا جائے گا''۔ چنانچہ احمد دین غازی کے خلاف مقدمہ قتل درج ہوا، ضروری تفتیش اور کارروائی کے بعد مقدمہ سیشن جج فیروز پور کی عدالت میں چلا۔ غازی صاحب نے کوئی وکیل نہ کیا اور سچ بول کر اقبالِ جرم کر لیا۔ چنانچہ انہیں عمر قید (14 سال) کی سزا سنائی گئی۔ سزا کاٹنے کے لیے ابتدا میں انہیں سنٹرل جیل لاہور منتقل کیا گیا۔ تقریباً 6 ماہ بعد سزا سنانے والے سیشن جج غازی صاحب سے ملاقات کے لیے جیل میں آئے اور غازی صاحب کو 700 روپے اور قرآنِ پاک کا ایک نسخہ دیا۔ غازی صاحب نے رقم شکریہ کے ساتھ واپس کر دی اور قرآنِ پاک کا تحفہ قبول کر لیا جو انہوں نے ایک قیدی ساتھی کو بطور تحفہ دے دیا۔

اپریل 1940ء میں عمر قید جیل میں کاٹنے کے بجائے حکم دیا گیا کہ غازی صاحب کو جزائر انڈیمان بھیج دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے غازی احمد دین اور کئی دیگر سزا یافتہ افراد کو کلکتہ لایا گیا۔ غازی صاحب کو بحری جہاز میں سوار کرانے کے لیے ان کا بھائی، اہلیہ اور ایک بیٹا بھی کلکتہ گئے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ وہ بھی غازی صاحب کے ساتھ جہاز پر جائیں گے ،اس پر کافی بحث وتکرار ہوئی لیکن آخر کار متعلقہ حکام نے انہیں ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ اس زمانے میں دوسری عالمی جنگ جاری تھی۔ ایک مرحلے پر جاپانی فوجوں نے جزائر انڈیمان پر حملہ کیا جو اس وقت برطانیہ کے قبضے میں تھے۔ اس جنگ میں برطانوی فوجوں کو شکست ہوئی اور جاپان نے ان جزائر پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد برطانوی فوجوں نے حملہ کر کے جاپان کو شکست دی اور دوبارہ برطانیہ نے جزائر انڈیمان پر قبضہ کر لیا۔ جنگ میں ہندوستانی فوجوں نے برطانیہ کی بہت مدد کی تھی، اس لیے بہت سے قیدیوں کی سزائیں معاف کر دی گئیں جن میں احمد دین غازی بھی شامل تھے۔ انہیں ہندوستان واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ احمد دین بھی اپنی اہلیہ کے ہمراہ بحری جہاز میں کلکتہ پہنچے جہاں ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ ان کا جسدِ خاکی لے کر اپنے آبائی گاؤں بُرہان پورہ راجہ جنگ میں پہنچ گئے۔ وہاں ان کی اہلیہ کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور گاؤں کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔

غازی صاحب ہمیشہ فخریہ انداز میں کہا کرتے تھے ''ویدا سنگھ کا قتل میں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیا، میں اس دنیا میں کسی اور چیز کا طلبگار نہیں ہوں۔ مجھے یہ جان کر دلی خوشی ہوتی ہے کہ ویدا سنگھ کے خاتمے کے بعد اسی روز مغرب کی اذان کھجور والی مسجد (انوارِ مصطفیٰ) میں دی گئی جس کا سلسلہ جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا''۔ احمد دین غازی کو دوبارہ ریلوے کے محکمہ میں ''ہیمر مین'' کی ملازمت مل گئی جہاں وہ اپنی ریٹائرمنٹ تک کام کرتے رہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ انتظار علی صاحب کی ملاقاتیں احمد دین غازی سے ہوتی رہتی تھیں۔ اُن کے ذہن میں غازی صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں جمع ہیں جن میں سے کچھ اُوپر بیان کی گئی ہیں۔

رائے ونڈ کے علاقے میں احمد دین غازی کی واپسی کے بعد سکھوں نے انہیں گھیر کر مارنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے، اس دور میں احمد دین غازی نے اپنے پاس دو چھریاں رکھی ہوتی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ میں چھریاں تھام کر جوش وخروش سے آگے بڑھتے تو سکھ فرار ہو جاتے۔ سکھوں نے جب احمد دین غازی کو بہت تنگ اور ہراساں کیا تو وہ بابا جھنڈے والی سرکار کے پاس حاضر ہوئے اور ساری صورتِ حال بیان کی۔ یہ سن کر بابا جی نے ان کو اپنی مسجد کے قریب ایک کمرہ رہائش کے لیے دے دیا جہاں مسلمانوں کی آمد ورفت رہتی تھی۔ اس لیے دشمنوں کو احمد دین غازی پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ اللہ کریم نے احمد دین غازی کو ہر خطرے سے محفوظ و مامون رکھا۔ اپنی زندگی میں غازی صاحب کو ایک عمرہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کا ایک بیٹا محمد اشرف امام مسجد تھا اور دوسرا بیٹا محمد اکرم میڈیکل آفیسر تھا۔ اپنی عمر کے آخری دو برس غازی صاحب نے اپنے بیٹے محمد اشرف کے پاس گزارے اور آخر کار وہ 31 مئی 1999ء کو واصل بحق ہوئے۔ ان کی خواہش کے مطابق انہیں آبِ زمزم سے غسل دے کر ان کی والدہ مرحومہ کی قبر کے ساتھ قبرستان بابا رحمت شاہ رائے ونڈ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

احمد دین غازی کے فرزند محمد اشرف ہمیشہ اس بات پر شاکی رہے کہ رائے ونڈ، راجہ جنگ اور دیگر علاقوں کے مسلمانوں نے ان کے والدِ محترم کی کماحقہٗ قدر نہیں کی۔ ان کے جنازے میں بھی سو سے کم افراد شریک ہوئے۔ غازی صاحب کے وصال کے بعد ان کے اہلِ خاندان مشکل حالات کا شکار رہے لیکن عام مسلمانوں اور کسی حکومتی ادارے اور نمائندے نے ان کی خبر گیری نہیں کی۔ احمد دین غازی نے تنِ تنہا جو شاندار کارنامہ سرانجام دیا تھا، اسی کی بدولت راجہ جنگ کے علاقے میں فضائیں پھر اذان کی دل نشین آوازوں سے گونج اُٹھیں۔ لاریب، دینِ اسلام کی اس عظیم خدمت کی بنا پر بابا احمد دین غازی مسلمانوں کے قومی ہیرو ہیں۔ ان کا حق بنتا ہے کہ ہم انہیں بہترین الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کریں۔

مزار کے کتبے پر بابا احمد دین غازی کو حاجی ظاہر کیا گیا ہے۔ انہوں نے کوئی حج نہیں کیا تھا۔ وہ جوانی کی عمر میں ہی قتل کے مقدمے میں ماخوذ ہو گئے تھے۔ 1945ء میں جزائر انڈیمان سے واپس آنے کے بعد انہوں نے ایک عمرہ ادا کیا تھا لیکن انہیں حج کرنے کا موقع نصیب نہ ہوا۔ انتظار علی صاحب نے بتایا کہ غازی احمد دین کو ان کی زندگی میں کبھی کسی نے حاجی کہہ کر نہیں پکارا تھا، عام طور پر لوگ انہیں غازی صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں محض ایک عمرہ کرنے کی وجہ سے لوحِ مزار پر حاجی لکھ دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ بابا احمد دین غازی کی قبرِ مبارک پر ابد الآباد تک اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

کشتۂ شمعِ رسالت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ

تفاخر محمود گوندل/جھیوراں والا

فضلائے فن اور ماہرینِ اقبالیات کا خیال (جس سے میں بھی بدرجۂ اتم متفق ہوں) ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کی شاعری القائی اور وہبی قسم کی تھی اور اس حقیقت کا اظہار حضرت علامہ نے خود بھی کیا تھا کہ مجھ پر شعروں کا نزول ہوتا ہے۔ احبابِ اقبال کہتے ہیں کہ نزولِ شعر کے وقت آپؒ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ آمد کا یہ سلسلہ و ملکہ اور عطا وابستگانِ علمِ عروض میں معدودے چند خوش نصیبوں کو مرحمت ہوتا ہے۔ جن خوش مقدر ہستیوں پر یہ عنایتِ ربانی ہوتی ہے میرے نزدیک حضرت علامہ اقبال ان میں سرِ فہرست ہیں کیوں کہ آپؒ کی شاعری کا زیادہ حصہ وحیِ حق اور فرامینِ رسالت مآبؐ کی توضیح وتشریح پر مشتمل ہے۔ شاید انھی فرمودات کے ساتھ جنون آمیز محبت کا اعجاز وثمر ہے کہ قسامِ ازل نے آپؒ کو شعر گوئی کا ایسا نادر الوجود ملکہ عطا فرمایا جس پر اہلِ فن مدتوں رشک کرتے رہیں گے۔ قرآن اور ذاتِ رسولؐ کے ساتھ اقبالؒ کی مجنونانہ محبت و شیفتگی نے آپؒ پر کیف وسرور اور جذب کی ایسی کیفیت طاری کر دی تھی جس کا اظہار ذوقِ تخیل کی گہرائی و گیرائی سے ہی ممکن ہے۔ سطح بین نگاہوں سے فکرِ اقبال کے عمق کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ بعض نظمیں تو واضح طور پر افلاک سے نازل ہوتی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لیے ایک مغربی مفکر نے جب اقبال سے صاحبِ قرآن حضور ختمی مرتبتؐ پر نزولِ قرآن کے حوالے سے تشکیک کا اظہار کیا تو آپؒ کے چہرے پر جلال کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آپؒ نے برملا ارشاد فرمایا کہ اگر مجھ ایسے پیروکارِ مصطفیٰؐ پر شعروں کا نزول ہو سکتا ہے تو حضور سرورِ کائناتؐ پر وحیِ حق کا نزول کیسے ممکن نہیں۔ اسی طرح جب جرمن مفکر توحیدِ ربانی کے بارے میں خطا کا شکار ہو کر صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا تو آپؒ نے برجستہ ارشاد فرمایا: ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

حضرت علامہ اقبالؒ نے توحید و رسالت کے بعد وابستگانِ رسالت مآبؐ کا تذکرہ بھی بڑے درد و سوز سے کیا ہے۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ، سیدہ فاطمۃ الزہرؓا اور سیدنا امام حسینؓ کے ذکرِ جمیل کے ساتھ ساتھ اسی محبت ووارفتگی سے رفقائے نبوت کے ساتھ بھی گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے اور یہ گہرہائے آبدار آپؒ کے فارسی اور اردو کلام میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں جن کا ہم حفظِ مراتب کے اعتبار سے تذکرہ کر رہے ہیں۔ اہلِ بیتِ اطہارؓ کے بعد جن دو رفیع الشان ہستیوں کا تذکرہ علامہ اقبال نے بڑے والہانہ اور سوز و گداز سے کیا ہے، شعر گوئی کی تاریخ میں اس کا جواب ممکن نہیں۔ ایک ''صدیقؓ'' کے عنوان سے اور ایک ''بلالؓ'' کے عنوان سے۔ اگرچہ ''بلالؓ'' کے عنوان سے ایک اور نظم بھی علامہؒ نے لکھی ہے مگر جس نظم کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی ہم پہلے اس کا تذکرہ کریں گے۔ مگر اس معرکتہ الآرا اور عدیم المثال شعری شہ پارے پر بحث سے قبل فدائے حبیبِ کبریا سیدنا بلالؓ کی عظیم شخصیت اور فداکارانہ کردار کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کے پس منظر میں سے متاثر ہو کر اقبالؒ کے قلم نے یہ جواہر آبدار صفحۂ قرطاس پر بکھیرے جو آج تک راہروانِ شوق کے دلوں کو منور کر رہے ہیں اور جس کا ایک ایک لفظ لعلِ یمن سے فزوں تر ہے۔

سیدنا بلالؓ ایک سیاہ فام حبشی غلام تھے۔ آپؓ طویل القامت اور ظاہری خدوخال کے اعتبار سے جوانِ رعنا نہیں تھے۔ نقش و نگار میں کوئی جاذبیت نہیں تھی مگر دل ایمان کی حرارت سے جگمگا رہا تھا۔ اگرچہ جسم بظاہر لاغر معلوم ہوتا تھا مگر قبولِ اسلام کے بعد رزمِ حق و باطل میں وہ فولاد کی طرح مضبوط بن گیا تھا۔ حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم رہنے والا یہ حبشی غلام جبر واستبدادِ امیہ بن خلف کے سامنے لوہے کا چنا ثابت ہوا۔ ایک بار حضورؐ اپنے رفیقِ خاص سیدنا صدیقِ اکبرؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ بلال قریب سے گزرے، حضورؐ نے اس بظاہر سیاہ فام حبشی (مگر جس کے دل کی تابش ماہتاب کو بھی شرما رہی تھی) کو بلا کر ارشاد فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں اور اسلام اس کا سچا دین ہے۔ تمھاری کیا رائے ہے؟ نجیب النفس بلال نے کہا: مجھے آپ کا ارشاد درست معلوم ہوتا ہے۔ بلال نے جواباً قبولِ اسلام کے لیے آمادگی کا اظہار تو نہیں کیا اور واپس آ گئے مگر اپنا نقدِ دل بارگاہِ محمد عربی ﷺ میں ہار آئے۔ شام تک بے قراری اور تذبذب سے کروٹیں بدلتے رہے اور غیر مرئی چاہت و محبت سے طبیعت میں بے چینی سی محسوس کرتے رہے۔ ایک انجانی سی کشش بارگاہِ رسالت مآبؐ کی طرف کھینچتی رہی۔ جمالِ مصطفیٰؐ کی رعنائی و زیبائی نے بے خودی کی ایسی دلفریب کیفیت پیدا کر دی جس نے آپؓ کو کشاں کشاں بارگاہِ نبوتؐ میں پہنچا دیا۔ حضرت بلالؓ کو یقیناً قبولِ حق کی پاداش میں جور و جفا اور عالمِ کفر کی ہمیت کا احساس تو ہوگا مگر جو دل اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ

مقامش عبدہٗ آمد و لیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

وہ دل کب ستمِ گرانِ کفر کو خاطر میں لاتا ہے۔ جس کو حضورؐ کی زلفِ عنبریں کا سایا نصیب ہو جائے وہ بھلا اُمیہ بن خلف کی بھڑکائی ہوئی آگ کے شعلوں کو کیا سمجھتا ہے جو اس ایمان افروز حقیقت کو اپنا اوڑھنا بچھونا اور اپنا ایمان و ایقان سمجھ رہا ہو۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

تُو فرمودی رہِ بطحا گرفتم
وگرنہ جز تو ما را منزلِ نیست

وہ جبر و استبداد اُمیہ بھلا کس طرح خاطر میں لائے گا۔ یقیناً عالمِ کفر کے بھڑکائے ہوئے شعلۂ استبدادیت کی جاں سوز تمازت کا اس غلامِ محمدِ عربی ﷺ کو احساس تو ہوگا اور یہ حقیقت بھی آپؓ کو ازبر ہوگی کہ منکرینِ حق کی بھڑکائی ہوئی شمشان بھومی میں کشتگانِ خنجرِ تسلیم کس طرح دن رات جل رہے ہیں مگر ان کے پائے ثبات میں جنبش پیدا نہیں ہو رہی۔ اور اس مکتبِ عشق میں قدم رکھنے سے وہ دن بھی دیکھنا پڑتے ہیں جن کے تصور سے حیات کانپ اٹھتی ہے۔ سیدنا بلالؓ کے پیشِ نظر یہ ابدی حقیقت بھی تھی کہ مکتبِ عشق میں داخل ہوتے وقت فکرِ سود و زیاں کو ترک کرنا پڑتا ہے اور بتانِ وہم و گماں سے کنارا کشی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اس مکتبۂ فکر میں تو وہ ہے جہاں ''بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد'' والا معاملہ ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے سیدنا بلالؓ کے ساتھ جس والہانہ وارفتگی و عقیدت کا اظہار کیا ہے اس پر بحث سے قبل آپؓ کا ایک اجمالی تعارف پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ معتبر ترین روایات کے مطابق آپؓ کا نام بلال اور کنیت ابو عبداللہ تھی۔ آپؓ کے والد کا نام رباح اور والدہ کا نام حمامہ تھا۔ آپؓ کے آباؤ اجداد حبشی النسل تھے۔ سیدنا بلالؓ مکۃ المکرمہ پیدا ہوئے، نحیف و نزار جسم، طویل القامت، رنگ سیاہ گندمی، سر کے بال گھنے اور خم دار تھے۔ آپؓ کے بالوں کی انھی پیچ و خم میں عشقِ رسولؐ کی تابش جھلک رہی تھی۔ آپؓ ایک ترش رُو اور سنگ دل انسان امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ اس نے بکریاں چروانے کا کام آپ کے سپرد کر رکھا تھا۔ امیہ بن خلف اسلام کے بدترین دشمنوں میں شمار ہوتا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضورؐ کے اعلانِ نبوت کے بعد اہلِ ایمان پر عالمِ کفر نے جبر و ستم کا ایک طوفانِ بدتمیزی بپا کر رکھا تھا۔ وحشت و بربریت اور جور و جفا کے اس عروج پر سیدنا بلالؓ کا قلادۂ غلامیِ مصطفیؐ زیبِ گلو کرنا آسان کام نہیں تھا مگر ازل سے جس کے عشق کا ترانہ بن چکی ہو وہ ان جاں گسل مصائب و آلام کو بھلا کیسے خاطر میں لاتا ہے۔ آپؓ کے دل و جان جمالِ محمدؐ کے اسیر بن چکے تھے۔ رگ رگ میں اللہ کی وحدت کا سرور رچ بس گیا تھا۔ حضورؐ کے ایک اشارۂ ابرو پر آپؓ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ آپؓ کے دل میں جب شعلۂ حق بھڑکا تو اس کی لَو کی حدت آپؓ کے آقا امیہ تک بھی پہنچ گئی۔ بس پھر کیا تھا وہ پیکرِ استبدادیت آتش زیر پا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا کہ میرے ایک حبشی النسل غلام کی یہ جرأت کہ وہ اس قافلے کا حصہ بن جائے جو ہمارے آباؤ اجداد کے عقائد کو باطل ثابت کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو۔ جسدِ بلال اُمیہ کی وحشت و بربریت کا تختۂ مشق بن گیا۔ وہ کون سی اذیت تھی جو اس غلامِ خدا و مصطفیؐ کو نہ دی گئی۔ اس ظالم و جابر نے آپؓ کو کلمۂ حق ترک کر دینے کے لیے جو اندازِ تشدد اپنایا اس سے تو چشمِ فلک بھی خوننابہ فشاں ہو جاتی ہو گی۔ قبولِ اسلام کے ''جرم'' کی پاداش میں آپؓ کو بہیمانہ اور وحشیانہ طریقے اپنائے گئے ان کو رقم کرتے ہوئے تو اہلِ سیر بھی کانپ کانپ اٹھتے ہوں گے۔ اُمیہ آپؓ کو تانبے کی طرح تپتے ہوئے ریگ زار پر لٹا دیتا اور اسی حالت میں آپؓ کے اس جسمِ اطہر پر بھاری پتھر رکھ دیتا جس کے بال بال سے اللہ کی کبریائی کی صدا گونجتی تھی۔ جب پھر بھی آپؓ اعلائے کلمۃ اللہ سے باز نہ آتے اور دستِ جبر کی ہر ضرب پر احد احد پکارتے تو وہ انھیں دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیتا جس سے آپؓ کے جسمِ اطہر کی چربی پگھل پگھل کر کوئلوں کو بجھا دیتی مگر آپؓ متواتر زبانِ حق فشاں سے نغمۂ توحید کی صدا بلند کرتے رہے۔ آپؓ کی یہ غایتِ جرأتِ رندانہ دیکھ کر وہ اور چراغ پا ہو جاتا کہ محمد عربی ﷺ کے لائے ہوئے فلسفۂ توحید میں وہ کیا لطافت و لذت اور کشش و جاذبیت ہے جو بلال کو اتنے جاں سوز مظالم کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہونے دے رہی۔ اس جذبۂ عشق میں وہ کیا حلاوت و مٹھاس ہے جس کی لذت فقط میرا غلام بلال محسوس کر رہا ہے مجھے نظر نہیں آتی، وہ مے خانۂ سرور ہے جس سے جام پی کر اس حبشی نژاد پر سرمستی کی عجیب کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ اس نے مغلوب الغضب ہو کر نوجوان آوارگانِ شہر کو بلایا اور آپؓ کو نشانِ عبرت بنانے کے لیے ان کے حوالے کر دیا کہ اس ''ضدی اور ڈھیٹ'' حق پرست کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے جس کی ہولناکیوں کی تاب نہ لا کر یہ دوبارا ''راہِ راست'' پر آ جائے۔ مکہ کے وہ آوارہ گرد نوجوان نشے میں دُھت، اہلِ ایمان کی بزمِ وفا کے اس صدر نشین کے گلے میں رسی ڈال کر مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے، تالیاں پیٹتے اور مغلظات بکتے، آپؓ کی تشنہ لبی کا مذاق اڑاتے، آپؓ کے ان گالوں پر طمانچے رسید کرتے جو نورِ محمدیؐ کی تابش سے دمک رہے تھے۔ آپؓ کے سینے میں طلوعِ نورِ سحر کی امید جگمگا رہی تھی۔ سیدنا بلالؓ کو اوندھے منہ لٹا کر بڑے بڑے بھاری پتھر رکھ دیے جاتے مگر مجال ہے کہ بظاہر اس سیاہ فام مگر اندر سے رخشندہ و تابندہ تر وارفتۂ توحید کے پائے استقلال میں معمولی سی جنبش

بھی ہوئی ہو۔ یہ بندگانِ جور و جفا اس حقیقت سے نابلد تھے کہ جاں سپارانِ حبیبِ کبریاؐ کو اگر تماشا گاہِ دار و رسن میں سولی پر بھی لٹکا دیا جائے تو وہ بصد فخر و مباہات اُچھلتے کودتے نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس شان سے مسکراتے ہیں کہ خود موت کی نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں۔ عالمِ کفر کی یہ بربریت تسلسل سے جاری رہی۔

ایک روز مزاج شناسِ نبوت سیدنا صدیقِ اکبرؓ کا گزر اس منطقۂ ستم کی طرف ہوا جہاں حق گوئی کی پاداش میں سیدنا بلالؓ کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسائے جا رہے تھے۔ یہ وحشیانہ تشدد دیکھ کر صدیقِ اکبرؓ کے گوشہ ہائے چشم سے آنسو ڈھلک پڑے۔ آپؓ کی شانِ فیاضی و استغنا جوش میں آ گئی۔ آپؓ نے فوراً امیہ کو پرکشش پیش کش کی کہ میرے پاس ایک خوب صورت خد و خال والا، خوب رُو طویل القامت غلام موجود ہے، وہ تم لے لو اور منہ مانگی رقم کے عوض یہ سیاہ فام حبشی غلام مجھے دے دو۔ اُمیہ نے یہ دل فریب پیشکش قبول کر لی اور سیدنا بلالؓ کو صدیقِ اکبرؓ کے حوالے کر دیا۔ آپؓ نے فوراً سیدنا بلالؓ کو آزاد کر دیا۔ یہ صاحبِ صدق و صفا، پیکرِ مہر و وفا، ایک عجیب احساسِ تفاخر و مسرت سے زخموں سے چُور سیدھے بارگاہِ مصطفویؐ میں پہنچے۔ یہ شانِ فداکاری دیکھ کر حضورؐ کی آنکھوں سے مسرت و ابتہاج کے آنسو ڈھلک پڑے۔ سیدنا بلالؓ ایک بے سر و پا اور نادار و مفلوک الحال انسان تھے۔ آپؓ کے پاس نہ رہنے کے لیے مکان نہ مال و متاعِ دنیوی۔ بس لے دے کے اک متاعِ عشقِ رسولؐ تھی جس نے بلالؓ کو ہم دوشِ افلاک کر رکھا تھا۔ اسی دولتِ حُبِ رسولؐ نے دنیا و مافیہا کی تعیشات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ڈاکٹر عابد نظامی مرحوم نے اس کیفیت کا نقشہ کتنے خوب صورت انداز میں کھینچا ہے:

اک عشقِ مصطفیٰؐ ہے اگر ہو سکے نصیب
ورنہ دھرا ہی کیا ہے جہانِ خراب میں

حضرت بلالؓ، سیدنا صدیقِ اکبرؓ کی عدیم النظیر شانِ فیاضی کی بدولت، امیہ بن خلف کے قاہرانہ جبروت کے سلاسل سے آزاد ہو کر بارگاہِ رسالت مآبؐ میں ایسے حاضر ہوئے کہ پھر وصالِ مصطفیٰؐ تک ایک لحظے کے لیے بھی جدا نہیں ہوئے۔ آپؓ کو غلامئ رسولؐ میں وہ لذت و لطافت حاصل ہوئی جس کا اظہار کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر و صاحبِ قلم کے بس کی بات نہیں۔ سنگِ درِ حبیبِ کبریاؐ کی بوسہ زنی آپ کا لازمۂ حیات بن گئی۔ اگر حضور سیدِ دو عالم گھر میں تشریف فرما ہوتے تو آپؓ درِ اقدس پر پڑے رہتے اور ایک بے تابانہ اشتیاق کے ساتھ انتظار کرتے کہ کب لکّہ ابرِ کرم نمودار ہو گا اور نہاں خانۂ دل جگمگا اٹھے گا اور آنکھوں کو روشنی اور ذہن کو بالیدگی عطا ہو گی۔ جب سرورِ قلب و جاںؐ باہر تشریف لاتے تو آپؓ پیچھے پیچھے نقشِ پائے مصطفیٰؐ کو چومتے جاتے۔ حضرت علامہ اقبال نے اسی سوز و سرور میں کہا ہو گا:

بیا، اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوییم
بپائے خواجہؐ چشماں را بمالیم

یتیموں کے والی اور غلاموں کے ملجا و ماویٰ حضور سیدِ دو عالمؐ نے تالیفِ قلبِ بلالؓ کی خاطر آپؓ کو اپنے گھر کا خزانچی مقرر فرما دیا اور اخراجات کا صادق و امین بنا دیا۔ اخراجات کا محاسب اسی کو بنایا جاتا ہے جس پر انتہا درجے کا اعتماد ہو۔ اس اعتبار سے سیدنا بلالؓ، اپنے آقا کا مرکزِ نگاہ بن گئے۔ اتنی قربت و شفقتِ مصطفیٰؐ شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوئی ہو اور یہ قربت و اعتماد ان انتہاؤں کو چھونے لگا کہ آپؐ نے فرما دیا کہ اگر بلال میرے بارے میں یہ کہہ دے کہ آپؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے تو یقین کر لیا کرو۔ اس سے بڑا قابلِ رشک مقام اور کیا ہو سکتا ہے؟ آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بلالؓ وہ شخص ہے جس کا جنت انتظار کرتی ہے۔ ایک بار حضورؐ نے فجر کی نماز کے بعد اپنے غلامِ صادق سے فرمایا کہ میں نے رات کو خواب میں جنت میں داخل ہوتے وقت اپنے آگے تمھارے قدموں کی چاپ سنی ہے۔ وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے تمھیں یہ فضیلت حاصل ہوئی ہے؟ بلالؓ نے دست بستہ عرض کیا: یا رسول اللہؐ! جب بھی وضو ٹوٹتا ہے تو وضو کے بعد ہر مرتبہ دو رکعت نماز پڑھتا ہوں۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد آپؓ حضرت سعد بن خیثمہ کے مہمان بنے مگر مواخاۃ میں حضورؐ نے سیدنا بلالؓ کو حضرت رویحہؓ کا بھائی بنایا۔ تعمیرِ مسجدِ نبوی کے بعد سیدنا بلالؓ کو پہلا مؤذنِ اسلام ہونے کا اعزاز بخشا گیا اور پھر قیامت تک اذانِ بلالی ایک ایمان افروز حقیقت آ گیں استعارا بن گئی۔ نماز باجماعت سے قبل اذان کہنا تو ویسے ہی لازم و واجب ہے اور حصولِ ثواب کا بہت بڑا ذریعہ بھی مگر اس کے ساتھ ساتھ ہر مؤذن اسے سنتِ بلالی سمجھ کر بھی ادا کرتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ کچھ فدایانِ رسولِ مکرمؐ ایسے بھی تھے جو بے سر و سامان تھے اور ارکانِ اسلام کی بجا آوری اور زیارتِ محمدِ عربیﷺ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، انھیں عرفِ عام میں اصحابِ صفہؓ کہا جاتا ہے۔ ان میں سیدنا بلالؓ بھی شامل تھے۔ پہلے معرکۂ حق و باطل غزوۂ بدر کے موقع پر سیدنا بلالؓ بھی شامل ہوئے اور انھیں اپنے بدترین دشمن امیہ بن خلف کو فنا کے گھاٹ اتار دینے کا موقع ملا یوں آپؓ کو اس کے ڈھائے ہوئے خوف ناک اور بہیمانہ ستم کا بدلہ لینے کا موقع ملا۔ حضورؐ سرورِ کائناتؐ کی، حضرت بلالؓ کے ساتھ شفقت و مودت کا عالم یہ تھا کہ ایک بار ایک صحابی نے از راہِ تفنن و طنز حضرت بلالؓ کو حبشی

عورت کا بیٹا کہ دیا۔ حضورؐ کے چہرۂ انور پر کبیدگی اور ناگواری کے اثرات نمودار ہو گئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: تم اب بھی زمانۂ جاہلیت کی باتیں کرتے ہو؟ حضرت بلالؓ کو ایک منفرد شرف و امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر آپؓ نے رسول اللہ کے حکم پر پہلی مرتبہ بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دی۔ وہ کیسا کیف آفریں لمحہ ہو گا جب اسی شہر مکہ میں ضرباتِ جبر و استبداد کفر سہنے والا ایک وارفتۂ توحید و غلامِ مصطفیٰؐ، کعبے کی چھت پر کھڑے ہو کر اللہ کی کبریائی کا ڈنکا بجا رہا ہو گا اور اس کی محبوب ذات بھی پاس ہی جلوہ افروز تھی۔

جب حضور سرورِ کائناتؐ اس عالمِ رنگ و بُو سے پردہ فرما گئے تو رنجِ فراقِ مصطفیٰؐ سے حضرت بلالؓ کی حالت غیر ہو گئی۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ آپؓ اذان کہتے ہوئے بے ہوش ہو گئے۔ خاص طور پر جب اشھد ان محمد رسول اللہ کی صدا بلند کرتے تو آپؓ پر رقت طاری ہو جاتی اور ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ جاتے۔ جب آقا کریمؐ کا روئے درخشاں نظر نہیں آتا تھا تو اضطراب و بے قراری حد سے بڑھ جاتی۔ اسی وجہ سے آپؓ مدینہ منورہ کو چھوڑ کر ملک شام میں جا بسے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جو آنکھیں صبح و مسا دیدارِ حبیبِ کبریاؐ کی عادی ہو چکی تھیں ان سے اب ہجر کے یہ جاں گداز لمحے برداشت نہیں ہو پا رہے تھے۔ دمشق میں قیام کے دوران ایک رات عالمِ رویا میں آپؓ کو حضور سرورِ کائناتؐ کی زیارت ہوئی، آپؐ نے اپنے عاشقِ صادق کو مخاطب ہو کر فرمایا! بلال! تم نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا۔ آپؓ اُسی وقت انتہائے بے قراری میں آنسوؤں کے بہاؤ میں مدینہ طیبہ کی جانب چل دیے۔ جب حسنین کریمینؓ نے آپؓ کو مسجدِ نبوی میں دیکھا تو ان سے اذان کی فرمائش کی۔ آپؓ اپنے محبوبؐ کے نواسوں کی فرمائش ٹال نہ سکے اور مجبوراً اذان کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جب آپؓ اشھد ان محمد رسول اللہ کی صدا بلند کرنے لگے تو فرطِ حزن و غم سے بے ہوش ہو گئے۔ صحابہ کرامؓ کو بھی یارائے ضبط نہ رہا وہ بھی دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے ایک اردو نظم میں کسی اور صحابی کے حوالے سے اس کیفیت کا نقشہ کتنے خوب صورت انداز میں کھینچا ہے۔

بے تاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک پل کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام

سیدنا بلالؓ نے چند دن مدینہ منورہ مین قیام فرمایا مگر پھر جب آقاؐ کا روئے تاباں نظر نہ آتا تو تڑپ تڑپ اٹھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ حریمِ محبت کے قرینوں سے بلالؓ سے بڑھ کر کون واقف ہو گا۔ لوگ دنیاوی محبوبوں کا فراق برداشت نہیں کر سکتے مگر یہ معاملہ تو محبوبِ خداؐ کا تھا۔ اس جدائی کی کیفیت سے بلالؓ کے لیے تو دنیا بھر کے فصحاؒ کے قلم سرنگوں نظر آتے ہیں۔ یہ اذان حضرت بلالؓ کی آخری اذان تھی۔ آپؓ پر سینے میں طوفانِ اندوہ و غم لیے واپس دمشق تشریف لے گئے اور باقی زندگی اسی عالمِ بے قراری میں گزار دی۔ اب آپؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپؓ کی اہلیہ نے کہا: ہائے کتنا غم انگیز موقع ہے۔ آپؓ نے فوراً ارشاد فرمایا: غم انگیز نہیں مسرت انگیز موقع ہے کیوں کہ میری روح چند لمحوں کے بعد روحِ محبوبؐ سے جا ملے گی۔ وفات کے بعد آپؓ دمشق میں باب الصغیر کے قریب دفن ہوئے۔ عشاقِ رسولؐ وہاں قیامت تک حاضری دے کر غلامِ مصطفیٰؐ کے ساتھ اظہارِ عقیدت کرتے رہیں گے۔ جب آپؓ کی وفات ہوئی تو یہ دوسرے خلیفۂ راشد سیدنا فاروقِ اعظمؓ کا دورِ خلافت تھا۔ جب سیدنا عمرِ فاروقؓ کو حضرت بلالؓ کی وفات کا پتا چلا تو سیدنا فاروقِ اعظمؓ جیسا مضبوط اعصاب کا مالک اور صاحبِ جلال و سطوت بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور بے ساختہ آپؓ کی زبان سے نکلا آہ! آج ہمارا سردار بلالؓ بھی بچھڑ گیا۔ سیدنا بلالؓ کے دو اعزاز ایسے تھے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے۔ ایک تو آپؓ حضورؐ کے ذاتی خزانچی بھی تھے اور امام المؤذنین بھی تھے۔ دوسرے یہ کہ آپؓ کو مسجدِ نبوی، مسجد الاقصیٰ اور بیت اللہ شریف، تینوں محترم و محتشم جگہوں پر اذان دینے کا شرف حاصل ہے۔

علامہ اقبالؒ نے آپؓ کی خدمت میں جو لامثال و بے عدیل خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کے متعلق میرا ایمان یہ ہے کہ ایسا حیات بخش، محبت و کیف آفریں اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہدیۂ تحسین دنیا کے کسی اور شاعر کے بس کی بات نہیں۔ سوچتا ہوں کہ وہ کون سا تابش انگیز لمحہ ہو گا جب حضرت علامہؒ کی کلکِ صدف بار جنبش میں آئی ہو گی اور اس نے وہ جواہرِ آب دار قرطاس پر اگل دیے ہوں گے جن کی چمک چشمِ اہلِ ایمان کو خیرہ کر رہی ہے۔

قارئینِ کرام! آئیں ذرا فداکارِ مصطفیٰؐ، حضرت علامہ اقبالؒ کی اُس نظم سے حظ اٹھائیں جس کے الفاظ مہ و مہر اور انجم افلاک کی عظمتوں سے بھی بڑھ کر معلوم ہوتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: ؎

چمک اٹھا جو ستارا ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے
کسی کے شوق میں تُو نے مزے ستم کے لیے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری
شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیمؑ سودا تھا
اویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا

مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو وہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید
خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید
گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر
تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برقِ جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اُس کے نظارے کا اک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُس کا
خوشا وہ دور کہ دیدارِ عام تھا اُس کا

قارئینِ کرام! اس رفیع الشان اور معرکتہ الآ را نظم کے ایک ایک شعر کے ایک ایک لفظ پر دنیائے علم و ادب کی تمام فصاحتیں اور بلاغتیں قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ جو لوگ شاعری میں موجود غنا و موسیقیت سے آگہی رکھتے ہیں وہی اس نظم کے کیف و کم کو صحیح طور پر جانتے اور پہچانتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر اپنے محسوسات بیان کیے دیتا ہوں۔ میں اُس وقت آٹھویں کلاس کا متعلم تھا جب پہلی مرتبہ قبلہ والد صاحبؒ مغفور کی آواز میں مترنم صورت میں یہ شہرۂ آفاق نظم سنی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت ابا جی کے پاس قبلہ ماموں جانؒ بھی فروکش تھے اور غالباً اُنھی کی فرمائش پر یہ کیف آفریں اشعار سنائے گئے تھے۔ اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ دونوں بزرگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ چوں کہ محترم ماموں جانؒ اقبالیات پر بھی کامل عبور رکھتے تھے اس لیے ان کی کیفیت ادراک واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔ نجانے اُس وقت درویشِ لاہوری کے قلب و ذہن کی کیا کیفیت ہو گی اور انھوں نے فدا کارِ حبیبِ کبریا (بلالؓ) کے حضور نذرانۂ عقیدت کے لیے شہ پرِ جبریلؑ کی جھنکار کی طلب کی ہو گی اور فیاضیٔ قدرت نے وہ فوراً ارزانی کر دی ہو گی۔ اگر چہ حضرت علامہؒ کا سارا کلام ہی افلاک سے اترتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس نظم سے عشق و محبت، خلوص و ایثار اور وارفتگی و شیفتگی کے جو سوتے پھوٹتے ہیں، تاریخ عروض میں اس کی مثال ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ذرا اس شعر میں پوشیدہ لطافت کا جائزہ لیجیے مجھے تو اس کے اظہار کے لیے اپنا قلم عاجز نظر آتا ہے۔

نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری
شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

اس شعر کا دوسرا مصرعہ عشاقِ مصطفیٰؐ کے تن بدن میں بجلیاں بھر دیتا ہے یعنی اس کائناتِ رنگ و بُو میں فقط روئے محمدِ عربی ﷺ ہی ایسا جمال افروز ہے جس کو صبح و مسا زیارت کرنے کے باوجود بھی سیری نہیں ہوتی اور زیارت کرنے والی چشمِ بلالؓ ہو تو اس پُر سوز کیفیت کو کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی تڑپا دینے والے تصور کو اسی نظم کا ایک اور مصرعہ بھی فروغ دے رہا ہے۔

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید
خنک دلے کہ تپید و دمِ نیا سائید

واہ مولوی سید میر حسنؒ کے شاگردِ رشید! تیرے قلم کی عظمت و رفعت، فصاحت و بلاغت اور جامعیت و سلاست پر قربان ہونے کو جی چاہ رہا ہے۔ اے کاش! جب حضرت علامہ اقبالؒ یہ نظم ''بلالؓ''، صفحۂ قرطاس پر یہ جواہرِ آبدار اُگل رہے تھے مجھ ایسا عقیدت مندِ اقبالؒ پاس موجود ہوتا تو آستانِ کلکِ اقبال پر بار بار بوسہ زنی کرتا۔ اس کمالِ فن پر کئی مرتبہ نثار ہونے کو جی چاہتا ہے۔

رفعتِ تخیل، زورِ بیان، موسیقیت و غنائیت، سوز و گداز اور وجد آفرینی کے اعتبار سے یہ نظم اپنی مثال آپ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اک موجِ سلسبیل رگ و پے میں ڈھلتی جا رہی ہے اور جیسے شبنم کے جھروکوں سے آفتاب کی کرنیں جھانک رہی ہوں، جیسے محفلِ انجم بوقلمونیٔ حیات کو جذبِ باہم کا درس دے رہی ہو، جیسے نسیمِ صبح کے جانفزا جھونکے رحمتِ پروردگار کی آمد کا پتا دیتے ہوں، جیسے چمن زارِ محبت میں ذوقِ دید، لطفِ تمنا کو اپنے دامن میں سجائے دعوتِ نظارا دے رہا ہو۔ غرض اس نظم میں پوشیدہ خصائص و کمالات حضرت علامہ اقبالؒ کے فنی محاسن کے ارتفاع کا پتا دیتے ہیں۔

حضرت علامہ اقبالؒ ''بانگِ درا'' میں ہی موجود ایک اور نظم میں (جو بلالؓ کے عنوان سے ہی ہے) مقام و مرتبۂ بلالؓ پر اپنے مخصوص انداز میں خامہ فرسائی فرماتے ہیں اور سکندرِ رومی کے جاہ و جلال، شوکت و سطوت اور تاج و تخت و حکومت اور دوسری طرف ایک خاک نشین حبشی زادہ غلامِ مصطفیٰؐ، بلالؓ کی، اللہ اور اس کے حبیبؐ کی بارگاہِ اقدس پناہ میں عز و شرف اور مقام کا تقابل پیش کرتے ہیں۔ اگر چہ از روئے تیقن و ایمان تو یہ تقابل محلِ نظر ہے اور بظاہر مناسب معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک، مگر حضرت علامہ اقبالؒ کے اظہارِ خیال کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ ؎

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

اور

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

پہلے بند میں ترجمانِ حقیقت و معرفت حضرت

علامہ اقبالؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ سکندر رومی ایسی جاہ وحشمت والا حکمران جس کی شہامت کی نظیر اس چرخِ نیلی فام کے نیچے کہیں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس کے سپاہ کے گھوڑوں کے سموں سے جبروت وجلال کی وجہ سے آگ نکلتی تھی۔ اس کی انانیت وکبریائی کے سامنے دارا و پورس کا مقام فروتر نظر آتا تھا۔ اس کے اس مقامِ نخوت و رعونت کو چشمِ فلک حیرت و استعجاب سے دیکھتی۔ جب وہ پورے جاہ وحشم اور احساسِ غرور وتمکنت سے چلتا تو سمجھتا کہ تمام عالمِ اشیا اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اس کے مقابلے میں مجسمۂ خلوص و وفا، پیکرِ عجز و انکسار، سرتاپا مسکنت ونجابت، خوئے دلنوازی وجذبۂ محبتِ رسولؐ میں سرشار حضرت بلالِ حبشیؓ کی عظمت و رفعت، سربلندی وتحریم دیکھیے کہ عشقِ رسولِ خدا میں غایت کی وجہ سے ان کا نام جبینِ افلاک پر مثلِ مہ ونجوم جگمگا رہا ہے۔ قیامت تک صاحبانِ فصاحت و بلاغت ان کی داستانِ الفتِ رسولِ معظمؐ سعادتاً اہلِ دل کو سناتے رہیں گے اور اس حسنِ ابلاغ کو اپنے لیے توشۂ آخرت گردانتے رہیں گے۔ جہاں بھی اور جب بھی جاں سپاران وفدایانِ توحید ورسالت کا ذکرِ خیر ہوگا، سیدنا بلالؓ کا تذکرۂ جمیلہ سرِ فہرست ہوتا نظر آئے گا۔ جب بھی مظلوم ومقہور، بے بس وبے یار ومددگار شہرِ مکہ کے حق پرستوں پر اہلِ جبروت و نخوت کا ظلم وستم حوالے کے طور پر آئے گا نورِ ایمان ویقین سے مستنیر حبشہ کے سیاہ فام غلام آقائے گیتی پناہ (بلالؓ) کا ذکرِ تاباں نجاتِ دنیوی واُخروی کا ضامن سمجھا جائے گا۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ایک جاہ پرست اور فرعون فطرت بادشاہ، سکندر رومی کا آج کوئی نام لیوا باقی نہیں۔ اگر اس کا نام لیا بھی جاتا ہے تو نفرت آمیز طریقے سے۔ تربتِ سکندر اگر کہیں ہے بھی تو ویرانی و پریشانی اور حزن و ملال کی آماجگاہ بنی ہوگی مگر اہلِ ایمان سیاحین گھر سے نکلتے وقت سیدنا بلالؓ کی لحد کی زیارت کی تمنا لیے آتے ہیں۔ آیئے! ذرا حضرت علامہ اقبالؒ کی وہ نظم پڑھنے کی سعادت حاصل کریں جس میں اہلِ قلب ونظر کے لیے ایک ایمان افروز سبق پوشیدہ ہے۔

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے
اہلِ قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جولاں گہِ سکندرِ رومی تھا ایشیا
گردوں سے بھی بلند تر اُس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
دنیا کے اس شہنشہِ انجم سپاہ کو
حیرت سے دیکھتا فلکِ نیل فام تھا
آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں
لیکن بلالؓ، وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلالؓ
محکوم اس صدا کے شہنشاہ اور فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخِ پیر
اقبالؔ! کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا، حبشیؓ کو دوام ہے

دوسرے بند میں حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ سیدنا بلالؓ کی وجہِ عزت وعظمت اور شہرت جذبۂ محبتِ مصطفیٰؐ تو تھا ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اذان تھی جو امیر وغریب اور اسود واحمر میں خوئے اختلاط پیدا کرتی تھی جس کا سوز وگداز آج بھی قلب وجگرِ چرخِ کبود میں لذت پیدا کر رہا ہے اور دنیا بھر کے تاجور اور گدا لحنِ بلالیؓ کے محکوم نظر آتے ہیں۔ آخری شعر میں حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اے اقبال! حضرت بلالؓ کی تمام رفقائے نبوت میں وجہِ امتیاز کیا ہے اور جس امتیاز نے رفعتِ افلاک سے بلند کر دیا۔ بلاشبہ یہ فیضِ عام منبعِ رشد وہدایت، مخزن ومعدنِ صراطِ مستقیم حضور سید المرسلینؐ کی دل پذیر وحیات بخش محبت ورفاقت کا اعجاز وثمر ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ شاید اسی اذان و لحنِ بلالیؓ کی تلاش میں یورپ وفلسطین کے دورے پر تشریف لے گئے تو وہ جستجویانہ نظروں سے متلاشی ہوں گے اور بالآخر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

سنی نہ مصر وفلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

حضرت علامہ اقبالؒ کی معروف طویل نظم ’’شکوہ‘‘ میں بھی ایک بند کے آخر میں حضرت بلالؓ کی مقدس زندگی کا تذکرہ فرماتے ہیں اور بارگاہِ رب العزت پناہ میں فریاد وشکوہ کناں ہے کہ ابھی تک مسلمانوں کے سینوں میں اپنے اسلاف کا جذبہ مرا نہیں ہنوز زندہ ہے اور فرماتے ہیں جس طرح آگ کے دہکتے ہوئے شعلوں کے سامنے حضرت بلالؓ مجاہدانہ عزم سے ڈٹے رہے اور ان کے پائے استقلال میں لرزش نہیں آئی اسی طرح ہم بھی عالمِ طاغوت کے سامنے نعرۂ تکبیر بلند کرنے کی طاقت و ہمت رکھتے ہیں۔

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالؓ حبشی رکھتے ہیں

⊙⊙⊙

"گجل" اردو شاعری میں نئی صنفِ سخن

سرور عالم راز سرور

اس مضمون کا موضوع وہ نئی صنفِ سخن ہے جو پچھلے کئی سالوں سے غزل پر "چھاپہ مار کر" اس کے ہمہ گیر سایہ تلے اپنی اصل شکل و صورت چھپانے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ اس خفیہ کاروائی کے پس منظر میں یہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ چونکہ یہ نام نہاد صنفِ سخن خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہے اس لیے اس کو غزل کی خوبصورت آڑ میں اردو دنیائے ادب پر مسلط کیا جاسکتا ہے۔ اس طرزِ عمل سے خود اس صنفِ سخن کو کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، غزل کو سخت نقصان پہنچنا یقینی ہے۔ چنانچہ یہ اشد ضروری ہے کہ اس "بتِ طناز" کا چہرہ بے نقاب کیا جائے اور اس کا اصلی رنگ وروپ اہلِ اردو کو دکھایا جائے۔

یہ نئی صنفِ سخن اپنی ظاہری صورت میں غزل سے کافی مشابہت رکھتی ہے۔ اس میں بھی ردیف و قافیہ اور بحر و وزن کے جملہ تقاضوں کا "حسبِ توفیق" خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی اشعار پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا ہر شعر بھی دو، کم و بیش ایک ہی لمبائی کے، مصرعوں سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ لیکن یہ اپنے مزاج، رنگ، مضامین اور زبان و بیان میں غزل سے اتنی مختلف ہے کہ اس کو ایک نئے اور منفرد نام سے تعبیر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس نئی صنف کو "گجل" کے نام سے پکارا جانا چاہیے۔ اس طرح اس کی انفرادیت بھی قائم رہے گی اور غزل سے اس کا دھندلا اور پامال سا رشتہ ہے اس کا اعتراف بھی ہوجائے گا: بارے "گجلوں" کا کچھ بیاں ہوجائے؟

روایتی غزل میں "سہلِ ممتنع" ایسے اشعار کو کہا جاتا ہے جو اپنے سیدھے سادھے مضامین کے باوجود دل و دماغ کو اپنے تاثر اور حسنِ زبان و بیان سے منور کردیتے ہیں۔ مثلاً

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومن خاں مومن)

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے
(میر تقی میر)

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
(میر تقی میر)

زیرِ بحث صنفِ سخن "گجل" میں بھی ایسی ہی ایک خصوصیت ہے، لیکن اس کو سادگی اور سلاست جیسے فرسودہ الفاظ سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ "گجل" میں سادگی تو ہے، لیکن ایسی کہ شعر کا مطلب سمجھنے کے لیے کسی کوشش یا تکلف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ شعر پڑھیے، فوراً سمجھ میں آجائے گا! یہ دراصل ایک طرح کے "نثری" اشعار ہوتے ہیں۔ یعنی نثر کے کسی ایک جملہ کو دو مناسب (یا غیر مناسب!) ٹکڑوں میں بانٹ کر آپس میں ٹانک دیا جاتا ہے۔ اس عمل میں مضمون کو روکھا، سپاٹ، بے رنگ اور اکثر مطلق غائب رکھنے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ کسی اور مناسب اصطلاح کی عدم موجودگی میں ہم ایسے اشعار کو "پیدل" کہہ سکتے ہیں! چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

پیدل اشعار:

آگ لگی ہے جنگل میں
کانپ رہا ہوں سردی سے
(آشفتہ چنگیزی)

پرندے جب نہ دیدے پھوڑ پائے
تو گردن داب لی اپنے پروں میں
(عطاالرحمان طارق)

ساحل، ریت، سمندر، شام
ساتھ ہے میرے پل بھر شام

....

دور ابھرتی لہروں میں
ڈوب رہی تھی ہنس کر شام
(شیدا رومانی)

جب غور سے دیکھا ہے تو اندازہ ہوا ہے
مہتاب کی کرنیں ہیں ستاروں کی سہیلی
(ضمیر کاظمی)

ہنس رہا ہوگا کسی شاخ کے پیچھے سورج
پیڑ سے چھین رہا ہے کوئی سایہ اس کا
(نعمان شوق)

بھیڑ اک نظروں کی اس کے بال و پر کے آس پاس
اک پرندہ نیلگوں آکاش میں اڑتا ہوا
(رئیس منظر)

ان "گجل" سے بھرپور جواہر پاروں کی داد نہ دینا اپنی کم علمی کے اعتراف کے مترادف ہے! اگر درج بالا میر و مومن کے اشعار جیسے اشعار کہنا آسان نہیں ہے تو یہ "پیدل" اشعار بھی ایک خاص ذہن و دماغ چاہتے ہیں جو ہر شاعر کی قسمت میں نہیں لکھا ہوا ہے! کبھی کبھی "پیدل" اشعار میں عوامی چاشنی بھرنے کے لیے "دیسی" الفاظ کی مدد لی جاتی ہے۔ یہ اضافی الفاظ جتنے کم سواد اور عام پسند ہوں، اتنا ہی "گجل" کا لطف بڑھ جاتا ہے اور بالکل "آم کے آم، گٹھلیوں کے دام" والی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسے "دیسی اشعار" کی چند مثالیں دیکھیے۔ دیسی اشعار:

کہاں ایسا تکلف ہے گھروں میں
بڑے آرام سے ہیں دفتروں میں
(عطاالرحمان طارق)

دیکھ شہادت کھیل نہیں
باز آ نقشہ بازی سے
(آشفتہ چنگیزی)

آٹھ برس کا بچہ میرا دوست قریبی لگتا ہے
کام بہت ہوگا پاپا کو، پیار سے جب سمجھاتا ہے
(آصف اظہر علی)

اک کمینے کی روٹیاں کھا کر
سخت بیمار ہو گیا ہوں آج
(پروین کماراشک)

روگ مت پال غزل کا اے اشک
تجھ کو یہ لڑکی نہ پاگل کر دے
(پروین کماراشک)

مرے ہی پاس تھے تخلیق کے منصب سبھی کل بھی
میں ماں ہوں، کس طرح سہہ آج دریوزہ نہیں سکتی
(مسرت زیبا)

''گجل'' کی ایک اور دل آویز ''خصوصیت'' اس کی ''پراسراریت'' ہے۔ شاعرانہ خلاقی کی یہ بہترین مثال ہے۔ الفاظ کی ہیرا پھیری، زبان و بیان کی ''نقشہ بازی'' اور ایسے الفاظ و تراکیب کا استعمال جن سے کان تو آشنا ہوں لیکن جن کی معنی آفرینی قارئین کی فکر و فہم کی چولیں ہلا کر رکھ دے، اس خصوصیت کے عناصرِ ثلاثہ ہیں۔ ایسے اشعار کو پڑھ کر قاری سوچتا ہے کہ ان کو سمجھنے کے لیے یا تو علمِ غیب کی ضرورت ہے یا پھر خود شاعر سے بلاواسطہ استفادہ کرنا ہوگا۔ اکثر وہ یہ سوچ کر صبر کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ چونکہ غزل شائع ہوگئی ہے اس لیے اس کا کوئی نہ کوئی مطلب بھی ضرور رہا ہوگا! اس خصوصیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر اشعار کا مطلب سمجھ میں آ بھی جائے تو یوں ہوتا ہے کہ صبح کو ایک اور شام کو دوسرا مطلب ہاتھ آتا ہے۔ روایتی اردو غزل اپنی پوری تاریخ میں ایسی کوئی مثال قائم نہیں کرسکی ہے۔ ''گجل'' کے ایسے اشعار کو ہم جاسوسی اشعار کہہ سکتے ہیں۔ جاسوسی اشعار:

مل گیا جب وہ نگیں پھر خوبیٔ تقدیر سے
دل کو کیا کیا وحشتیں ہیں سنگ کی تاثیر سے
(شعیب نظام)

روشنی کا بدن ہوا ریزہ
روح پر گرد رات کا ریزہ
آج کس نے یہ دل پہ دی دستک
محورِ زیست میں انا ریزہ
(محمد وسیم)

ٹوٹے اگر ہوا تو اندھیرے کا گل جھڑے
مکتوب لے گئی ہے سویرے کے نام کا
(جاوید ناصر)

ان جنگلوں میں دوستو، رستے بھی کھو گئے
دشتِ تعلقات بھی آئے سراب میں
(مختار شمیم)

دیکھ اے چشمِ طلب دیدہ، یہاں مت کھلنا
کیسی شادابی، جہاں خون کی بارش ہی نہیں
(شام کلیم)

مرے شریک مسافر ہیں اور صحرا بھی
شجر نہ دے مرے سائے کا لمبا قد کردے
(راشد امکان)

''گجل'' خود ہی ایک تجربہ کہی جاسکتی ہے، پھر بھی ''گجل گوشعرا'' اس نئی صنف میں نت نئے تجربات کی پھنکری ڈال کر اس کا رنگ چوکھا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ شاعر ''گجل'' کی زبان و بیان کے انتخاب میں اس کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ سڑک پر چلتا ہوا ہر شخص بلاتخصیصِ ذوق وصلاحیت ایسی شاعری کا مطلب سمجھ جائے۔ اس قسم کی بے ساختگی اور ابتذال کے ڈانڈے براہِ راست بازار اور چوراہے سے ملتے ہیں۔ دراصل ''گجل'' ایسی صنف کی پرکھ کے لیے ایسے ہی کم قیمت اور بازاری پیمانہ کی ضرورت بھی تھی۔ ایسے اشعار کو اگر ''سودیشی'' کے نام سے پکارا جائے تو غیر مناسب نہیں ہوگا۔ چند مثالیں حاضر خدمت ہیں۔: سودیشی اشعار:

الجھے داڑھی چوٹی میں
کھیلو پھاگ لنگوٹی میں
بکتا دیکھا ہے انسان
دوبوٹی اک روٹی میں
آج مظفر چاند ہوئے
کل تک تھے کجلوٹی میں
(مظفر حنفی)

دیکھے جو میں خواب وہ چلّی کے خواب تھے
آنکھوں میں پھر رہی ہے وہ خوابوں کی کہکشاں
(قمر نکاروی)

یہ بھوک بیچ میں آخر کہاں سے آئی ہے
یہ روٹیاں بھی تری ہیں، شکم بھی تیرے ہیں
(عقیل شاداب)

تمہارے بن مرا پردیس میں اب دل نہیں لگتا
میں دن جانے کے گنتی ہوں کیلنڈر سامنے رکھ کر
(مسرت زیبا)

''گجل'' میں تجربہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ''گجل گو'' اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے فارسی نما الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چونکہ آج کل فارسی کا رواج بہت کم ہوگیا ہے، اس لیے شاعر عوام کی آسانی کے لیے ایسے الفاظ میں ''دیسی'' رنگ ملاتا جاتا ہے تا کہ عوام کی معلومات میں بھی اضافہ ہو اور وہ اس کی شاعری سے کم و بیش لطف اندوز بھی ہوسکیں۔ ذیل میں ایسے ''معلوماتی'' اشعار کی مثالیں دی جارہی ہیں۔ پڑھیے اور سر دھنیے!

معلوماتی اشعار:

بڑی لطیف تھی وہ بات جس کے سننے سے
لہو بدن میں ہو اہے ابال آمادہ
(خالد بشیر)

کب تک میں کواڑوں کو لگائے ہوئے رکھتا
دن اُگتے ہی احوال بیانی نکل آئی
(احمد کمال پرویز)

میں واقف ہوں تری چپ گوئیوں سے
سمجھ لیتا ہوں تیری ان کہی بھی
(سلیمان خمار)

خلوت کدۂ دل پہ زبوں حالی بسیار
ہے صورتِ گنجینۂ الفاظ و معانی
(عین تابش)

خشک و تر، زرد، ہری فصل کعصفٍ ماکول
اب کسی خواب سے چسپاں نہیں تاویل کوئی
غیر مربوط، گماں وصف، محرف، مبہم
یعنی ہر شخص ہوا آیتِ انجیل کوئی
(سلیم شہزاد)

ایک دن چھن جائے گا، آنکھوں سے سارا رنگ و نور
دیکھ لے ان کو کہ یہ منظر ہمیشائی نہیں
(مہتاب حیدر)

روایتی غزل شاعر پر بہت سی پابندیاں لگاتی ہے۔ اول تو غزل گوئی کے لیے فطری صلاحیت کی ضرورت ہے۔ پھر زبان و بیان کا علم، اہلِ ذوق کی صحبت، اساتذہ کے کلام کا شاگردانہ مطالعہ (تاکہ سر جھکا رہے اور ٹھوکر نہ لگے!) اور اگر خدا توفیق دے تو کسی صاحبِ علم و فن کے سامنے زانوائے تلمذ تہہ کرنا بھی ضروری ہیں۔ اب سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک غزل گو کے یہاں نہ صرف ردیف و قوافی، وزن و بحر کا التزام ہوتا ہے، بلکہ زبان و بیان کی نزاکتوں اور تقاضوں کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے اور غزل کے دیگر جملہ لوازمات بھی موجود ہوتے ہیں۔

"گجل" ان پابندیوں کو یکسر تو نظر انداز نہیں کر سکتی، البتہ جابجا ان فرسودہ اور دقیانوسی بندشوں کو اتار پھینکنے میں برائی بھی نہیں سمجھتی۔ کس کو فرصت ہے کہ آج کل کے مصروف دور میں مصرعوں کو وزن اور بحر کے ترازو میں تولے اور ان پیچیدگیوں میں اپنا اور دوسروں کا وقت خراب کرے! آخر "گجل" ایک صنفِ سخن ہے، مدرسہ کا سبق تو نہیں ہے! چنانچہ "گجل گو" جہاں تہاں ان پابندیوں سے اغماز برت لیتا ہے اور ایک فقیرانہ بے نیازی سے "گجل" پوری کر کے اپنے فرض سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اس قسم کے اشعار کو ہم پرہیزی کہیں تو بیجا نہیں ہوگا۔ کچھ جواہر پارے ملاحظہ فرمائیے۔

پرہیزی اشعار:

ہر غم کو سہنے کی طاقت دینا مجھے
کوئی بھی غم اس پہلے مت دینا مجھے
ایسا مت کرنا جیتے جی مر جاؤں
مرنے سے پہلے شہرت دینا مجھے
(محمد علوی)

اب اپنی چیخ ہی کیا، اپنی بے زبانی کیا
محض امیروں کی زندگانی کیا
(عذرا پروین)

وہ درمیانِ روز و شب وقفہ ہے کیا
زیرِ افق میری طرح جلتا ہے کیا
(شفق سوپوری)

شاید تھا اک بگولے میں تنہائیوں کا غم
زیبا جو دل کے گملے میں کیکٹس لگا مجھے
(مسرت زیبا)

ہر چند کہ اب تک کی یہ تحریر "گجل" کے تعارف کے لیے بہت کافی ہے، پھر بھی اس کی ایک خوبی ایسی مزید ہے جو حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہے۔ جہاں غزل ہر شعر کے دونوں مصرعوں میں ربطِ باہمی کو لازمی گردانتی ہے، وہیں "گجل" ایسے فضول اور بے مصرف تقاضوں کا التزام اپنے لیے باعثِ ہتک جانتی ہے۔ "گجل" کے اشعار کے مصرعوں میں ربطِ باہمی کے فقدان کے بہت سے فوائد ہیں۔ ایک تو "گجل گو" شاعر کو اپنے ذہن پر زیادہ زور نہیں ڈالنا پڑتا۔ دوسرے، دونوں مصرعوں کا اختلافِ خیال ایک ہی شعر کو دو یا دو سے زیادہ مطالب ظاہر کرنے کی قدرت عطا کرتا ہے۔ اس طرح دس اشعار کی "گجل" میں بیس اشعار کا مزا آسانی سے مل سکتا ہے اور اجمال میں تفصیل کا حسن بھی پیدا ہو جاتا ہے! چونکہ اس طرح کی "گجل" کا ہر شعر پہلودار ہوتا ہے، ہم ایسے اشعار کو "دورخی" کہہ سکتے ہیں۔ درج ذیل اشعار اس خصوصیت کی اچھی نمائندگی کرتے ہیں:

دورخی اشعار:

نئی پرواز ویرانی
ہر اک آغاز ویرانی
خوش آہنگ انکشافوں سے
خلا کا راز ویرانی
(ریاض لطیف)

یہ کس کے ہاتھ نے مسمار کر دیا ہے ہمیں
سوال گونج رہے ہیں شجر شجر کیسے
(پروین راجا)

بچے سنا کریں گے مزے کی کہانیاں
ذہنوں میں بات آج کی ڈالی نہ جائے گی
(عطاالرحمان طارق)

بو دی تھیں میں نے اپنی دسوں انگلیاں جہاں
پیروں میں آ رہا ہے وہی راستہ سا پھر
(رشید امکان)

میں مانتا ہوں کہ ان دیکھے سائبان کی شام
یتیم ہوگی مگر خود کفیل تو ہوگی
(احمد کمال پروازی)

جسم غائب ہے اور سر موجود
زندگی تیغ بے سپر موجود
(واجد قریشی)

"گجل" کی یہ "صد رنگی" روایتی غزل کے نزدیک بے مایہ اور "بے حضور" سہی، لیکن "گجل" کو اس سے دل برداشتہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ اپنی ذات میں ندرت اور تنوع کے اتنے امکانات رکھتی ہے جو غزل کو اپنی طویل عمر میں نصیب نہیں ہو سکتے۔ "گجل گو" شعرا کو غزل دوست حلقہ؟ فکری تنقید و تبصرہ کا خیال نہیں کرنا چاہیے اور صرف اس وجہ سے اپنی تخلیقی کاوشوں میں کمی نہیں کرنی چاہیے کہ اصحابِ فکر و نظر "گجل" کی پذیرائی میں کفِ افسوس ملتے ہوئے یہ پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

(بشکریہ: احمد ندیم رفیع، امریکا)

نسیم سحر/راول پنڈی

روح جب جسم سے نکل جائے
ایک مٹی کا ڈھیر ہے، اور بس!

کھول دے مجھ پہ یہ عقدہ سائیں
میں سمندر ہوں کہ قطرہ سائیں؟
جس سے جھانکے ترا جلوہ سائیں
مجھ پہ وَا کر وُہ دریچہ سائیں
رکھ مجھے اپنی اماں میں ہردم
میں ہوں انسان گزیدہ سائیں
تیری بس ایک نظر ہو جائے!
ہر سمندر ہو جزیرہ سائیں
تُو ہی کچھ راہنمائی کر دے
زندگی ہے کہ معمّہ سائیں؟
مجھ کو پہچان عطا ہو جائے
دے کوئی اپنا حوالہ سائیں
تُجھ سے مَیں کیسے الگ ہو جاؤں؟
مَیں تو ہوں تیرا ہی سایہ سائیں!
میرے ویرانے میں بھی کِھل جائے
تیری خوشبو کا حدیقہ سائیں
جس سے سانس گھٹا جاتا ہے
اب کُھلے سانس جھروکہ سائیں
مُجھ پہ کچھ اور بھی کچھ روشن کر دے
میرا ادراک دریچہ سائیں

شاداب اُس کے ہونٹ تھے، جیسے ہو رَس بھری
اِس واسطے ہر آنکھ تھی اُس پر ہَوَس بھری
سوچا تھا، کچھ سکون کی سانسیں نصیب ہوں
برسات کی وہ شام تھی لیکن اُمَس بھری
مَیں ڈھونڈنے گیا تھا ذرا اَور ذائقہ!
لیکن ترے کنویں سے بھی ملکی عَبَث بھری!
کچھ بھی نہ دے سکی تھی مجھے لذّتِ وصال
صد شکر، ہجر نے مری ایک ایک نَس بھری
مُجھ میں شگفتگی بھی ہے، لیکن اَنا بھی ہے!
ہرگز کوئی نگاہ نہ اُٹھے تَرَس بھری
اِک پَل میں میری ساری تھکن دُور ہو گئی
انگڑائی اُس نے لی تھی ذرا آلکس بھری
شہروں کی سمت جانے سے کیوں ڈر رہے تھے لوگ
قصبے میں کتنی دیر میں اِک خالی بس بھری!
اب کیا بتاؤں نشہ تھا کیا اُس کے لمس میں!
اُس نے مرے وجود میں جب سوم رَس بھری
چمڑے کی مَشک پیاس نہ اپنی بُجھا سکی
مَیں نے اگرچہ پانی سے بارہ برس بھری
شاید کچھ اَور دِن مرے کٹتے سکون سے
یہ آگ میں نے سینے میں کیوں ہر نَفَس بھری
انکار کرتی وُہ تو نہ ہوتا مجھے ملال
آمادگی تھی اُس کی بڑی پیش و پَس بھری
پھر اِک عجیب لہجے میں وُہ بولنے لگا
باتیں تو لگ رہی تھیں بڑی اُس کی چَس بھری!
شاخِ گلاب چھونے پہ یہ تجربہ ہوا
ہر پھول میں ہی دیکھی چُبھن کیکٹس بھری!
سَیرِ چمن کا لطف ہی غارت ہوا نسیم
پھولوں کی ہر روِش تھی بڑی خار وخس بھری

کہیں سے کُچھ جو فراغت کے پَل کشید کروں
مَیں لاشعور سے تازہ غزل کشید کروں
مُجھے یہ جادوگری کا ہُنر نہیں آتا
کہ بانجھ دھرتی سے مَیں پھول پھل کشید کروں
یہ چاہتا ہوں اُسے کہہ کے بے وفا اِک دِن
پھر اُس کے چہرے سے ردِ عَمَل کشید کروں
یہ کارِ عِطر گشی وقت مانگتا ہے، سو مَیں
جو آج کر نہیں پایا، وہ کَل کشید کروں
عجیب شخص ہوں، خواہش عجیب تر ہے مری
کہ اپنی بے عملی سے عمل کشید کروں
مرے خیال میں یوں ہونا عین ممکن ہے
کہ اُلجھنوں کے سمندر سے حل کشید کروں
خیال آتا ہے، اپنا محاسبہ کر کے
جو ساری عمر کا ہے ماحَصَل، کشید کروں
کِنارا یومِ اَبَد کا جو ہاتھ آئے مرے
اُسے نچوڑ کے یومِ ازل کشید کروں
مرے خدا نے مجھے یہ کمال بخشا ہے
بھڑکتی آگ کے شعلوں سے جَل کشید کروں
تُو ایک روز عطا کر مُجھے وجود اپنا
کہ اِس طِلسم کا نعم البدل کشید کروں
نسیم ایسے چمتکار سے ہوں خوفزدہ
کہ مانگوں زندگی اَور مَیں اَجل کشید کروں

ملگجی سی سویر ہے، اور بس!
پھر تو سارا اندھیر ہے، اور بس!
زلزلہ دے رہا ہے یہ پیغام
ایک جھٹکے کی دیر ہے، اور بس!
روح جب جسم سے نکل جائے
ایک مٹی کا ڈھیر ہے، اور بس!
پیٹ خالی ہے، اور غریب کے گھر
ایک خالی چنگیر ہے، اور بس!
حکمرانوں پہ کیا یقین کریں
جھوٹ ہے، ہیر پھیر ہے، اور بس!
عدل و انصاف کے چراغ بجھے
دیر ہے اور اندھیر ہے، اور بس!
ایک چوپال، وہ بھی اُجڑی ہوئی!
ایک سُونی منڈیر ہے اور بس!

ڈاکٹر نواز کاوش / بہاول پور

مری بیٹی تری خدمت میں کیسے بھول سکتا ہوں
تہجد میں مرے ہر سانس کی مانگی دعا ہے تو

میری بات سن کبھی تنہا بیٹھ کے خود سے بھی یہ سوال کر
تجھے کیا ملے گا عزیز جاں مجھے اپنے دل سے نکال کر

اسے دل کی مٹھی میں پال کر کئی ماہ کر، کئی سال کر
یہ دوا ہے عشق میں درد بھی نہ ملول ہو نہ ملال کر

مجھے عافیت کے سراغ دے مرے راستوں کو اُجال کر
مجھے اور کچھ نہیں چاہیے مرے پرسکوں ماہ و سال کر

تجھے کامیابی نصیب ہو مرے آنسوؤں کی نہ فکر کر
مجھے مرے حال پہ چھوڑ دے مرے درد کا نہ خیال کر

میں تھا دشمنوں کے حصار میں مجھے کیسے اس نے بچا لیا
وہ خوشی سے کتنا ہے شادماں مجھے دشمنوں سے نکال کر

مرے چارسو ترے خواب ہیں کبھی جاگتے کبھی نیند میں
کبھی بال کھولے پھوار میں دبے پاؤں آ یہ کمال کر

اگر آ گئے ہو تو جانِ جاں مرے گھر کا رستہ ہے پُر خطر
یہ ہیں اونچے نیچے سے راستے چلے آؤ خود کو سنبھال کر

یہ جو زندگی ہے نواز جی یہاں رائیگانی ہے چارسو
تمہیں زندہ رہنا ہے گر یہاں کوئی کام بھی تو مثال کر

مجھے اس بار بھی لگتا ہے رسماً ہی ملا ہے تو
ترے لہجے کی تبدیلی بتاتی ہے خفا ہے تو

بچھڑنے کا ابھی سے خوف میرے دل پہ طاری ہے
یہ کیسے موڑ پر ظالم مجھے آ کر ملا ہے تو

تو جتنا ظلم کر آندھی چلے گی خلق کی ہر سو
فصیلِ شب پہ بس اک آخری جلتا دیا ہے تو

بلندی سے اُتر کر دیکھ آنکھوں میں چھپی نفرت
یہ کیسے تو سمجھ بیٹھا ہے دھرتی کا خدا ہے تو

میں کیوں نہ تیرے رستوں پر بچھا دوں خواب پھولوں کے
مجھے لگتا ہے جیسے حبس میں تازہ ہوا ہے تو

مری بیٹی تری خدمت میں کیسے بھول سکتا ہوں
تہجد میں مرے ہر سانس کی مانگی دعا ہے تو

میں مل لیتا ہوں تنہائی میں مسلکِ عشق ہے میرا
مرے اس دل کی وادی میں کہیں غارِ حرا ہے تو

مرے خوں میں بھی پکے راجپوتوں کی حرارت ہے
مسافت تھی، مری ضد تھی کہاں ایسے ملا ہے تو

مرے بھائی کوئی مشکل نہ رستہ روک پائے گی
مری ماں کی دعاؤں میں ہمیشہ ہی رہا ہے تو

بہت مایوس تھا نفرت بھرے ماحول میں کاوش
ترے آنے سے لگتا ہے محبت کی فضا ہے تو

دلوں میں خوف پلتے جا رہے ہیں
یہ کس رستے پہ چلتے جا رہے ہیں

سجا کر خواب کتنے آئے تھے ہم
کفِ افسوس ملتے جا رہے ہیں

کہاں ملتا ہے کوئی یوں اچانک
مگر ہم ہیں کہ چلتے جا رہے ہیں

بچھڑنے کی گھڑی آئے سے پہلے
یہ چشمے کیوں اُبلتے جا رہے ہیں

یہ خوش فہمی کا موسم ہے تو ہے
یہ جگنو ہیں کہ جلتے جا رہے ہیں

بلا لیتے، بلانا چاہیے تھا
مجھے تو بس بہانا چاہیے تھا

میں صدیوں کے سفر سے لوٹ آیا
اسے بھی لوٹ آنا چاہیے تھا

کہو کیسا ہوں میں برباد ہو کر
تمہیں تو مسکرانا چاہیے تھا

یہ موسم کا تقاضہ ہے کہوں کیا
تمہیں پہلو میں آنا چاہیے تھا

کہا اس نے نہیں ملنا دوبارہ
ہمیں اس کو منانا چاہیے تھا

محبت ہے کہا اس نے مجھے تو
یہ کہنے کو زمانہ چاہیے تھا

کہا اُس نے بسو دل میں خوشی سے
مجھے بھی اک ٹھکانا چاہیے تھا

تمہیں بے باک یوں ملنے سے پہلے
مرے خوابوں میں آنا چاہیے تھا

جہاں دھڑکنے ہوں ہر سو چاہتوں کے
ہمیں ایسا گھرانہ چاہیے تھا

دلوں میں خیمہ زن مایوسیاں ہیں
خوشی کا شادیانہ چاہیے تھا

دکھوں کا دشت ہے کارِ محبت
ہمیں دامن بچانا چاہیے تھا

وہ بن کر معجزہ آئے ہیں کاوش
ہمیں موسم سہانا چاہیے تھا

تری خالی جگہ کو بھر رہے ہیں

فرحت احساس

اردو کے عصری ادبی منظرنامے پر فہمی بدایونی کی آمد ''دیر آید درست آید'' کے مصداق ایک ایسا واقعہ ہے جو پیش نہ آتا تو ادب کے ارباب قضا و قدر کی نا اہلی پر دلیل ہوتا اور ہمیں ایک ایسی خوشگوار حیرت یافتگی سے محروم رکھتا جو اردو شاعری، خاص طور پر اس کی مشاعراتی دنیا کی نشاۃ الثانیہ کے لیے لازمی تھی۔ یہ کہنا کہ وہ دیر سے آئے در اصل فریب نظر کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ چل تو بہت پہلے چکے تھے، اندر اندر تشکیل ہوتے ہوئے، مگر پہنچے اب ہیں یا پھر یہ بھی کہ وہ پہنچ تو پہلے چکے تھے، نظر اب آئے ہیں۔

فہمی صاحب کی شاعری کو ایک ادبی واقعہ قرار دینا میرے لیے ادبی، نظری معاملہ بھی ہے اور ادبی سماجیات کا سوال بھی، جس میں سوشل میڈیا کی مظہریات بھی شامل ہیں۔ ان دونوں یا تینوں محاذوں پر اردو ادبی معاشرے (اگر ایسی کوئی چیز اب بھی موجود ہے) یا ادبی برادری پر فرقے، قبیلے، حلقے نے فہم، ادبی فہم، سماجی حرکیات کی ادبی صلاحیت کی نمود کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے، اس کے لیے اب تک ادبی معاشرے کو ایک طریق کار مہیا رہا ہے۔ اس طریق کار کے تحت ہر نئی ادبی آمد کو خاصے طویل عرصے تک ایک امتحانی عمل سے گزارا جاتا تھا اور پھر اسے قبولیت کی سند حاصل ہوتی تھی۔ رد کیے جانے کا ذکر اس لیے غیر ضروری ہے کہ ادبی معاشرے کا کام محض قبولیت دینا ہے، رد کیا جانا جو قبولیت نہ ہونے کا فطری مظہر ہوتا تھا اسے ادبی کینن (Canon) یا شمس الرحمٰن فاروقی کی ترجمہ کردہ اصطلاح میں ترتیب استناد کہتے ہیں جو کسی بھی زمانے میں موجود کسی بھی ادبی معاشرے سے وابستہ تسلیم شدہ افراد یا ادبی فہم کے عمومی 'احساس' کے تحت عمل میں آتی تھی۔ یہ ادبی معاشرہ ایک ٹھوس، محسوس اور ایک خاص جغرافیائی حدود میں واقع وجود ہوتا تھا، مثلاً اردو شاعری کے حوالے سے دہلی یا لکھنؤ یا رام پور، عظیم آباد یا پھر حیدرآباد کا ادبی معاشرہ۔ اب چونکہ کوئی مرئی ادبی معاشرہ وجود نہیں رکھتا، اس لیے ادبی کینن سازی کا عمل بھی انتشار یا من مانے پن کا شکار ہو گیا ہے۔ سوشل میڈیا کے آنے اور مستحکم ہو جانے کے بعد ادبی معاشرہ ایک ایسی نادیدگی میں تبدیل ہو گیا ہے جو ہوا کی طرح ہر جگہ ہے اور کہیں بھی نہیں ہے۔ فہمی صاحب کی شاعری کا ظہور یا نمود (اس کی شعری قدر و قیمت نہیں) چونکہ سوشل میڈیا کے اثر و نفوذ میں انقلابی اضافے کے اور ادبی کینن سازی یا کینن شکنی کے ایک نہایت پیچیدہ عمل سے گہرا تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس کے حوالے سے ایک فکری موقف یا طریق کار کی تشکیل ایک ادبی ذمہ داری ہے جس کا بار اصولی پر ہماری جامعات کے اردو شعبوں، غیر ادارہ جاتی آزاد ادبی فکر سازوں یا ادبی صحافت سے وابستہ ذہنوں کو اٹھانا چاہیے۔ لیکن ابھی ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ جامعات کے بیشتر سرکاری تنخواہ دار اردو افسروں کے لیے تو ان کا ورود مسعود شاید ابھی تک ممکنات میں نہیں آیا ہے کہ وہ فلموں کی پولیس کی طرح ہمیشہ کسی بھی ادبی جائے واردات پر حادثہ ہونے کے بہت بعد پہنچتے ہیں۔ غیر ادارہ جاتی اور ادبی فکر سازوں کا دھیان بھی ابھی ادھر مبذول نہیں ہوا ہے۔ رہی بات ادبی صحافت کی تو ایک استثنا کو چھوڑ کر باقی سب خیریت ہے۔

اس قصے کو ذاتی احوال کی طرف سے بیان کروں تو ابھی پانچ چھے برس ہوئے ہوں گے کہ فہمی صاحب کی کتاب کے اجرا کی محفل میں ان سے پہلی ملاقات سے پہلے تک میں ان کے نام سے واقف نہیں تھا۔ یہ ایک عجیب صورتحال تھی کہ ان کے شعر سننے کے بعد ایک طرف تو میں ان سے ناواقف ہونے پر شرمندہ ہو رہا تھا تو دوسری طرف اردو اور دیگر زبانوں کی ادبی صورت حال پر اچھی خاصی نظر ہونے کا میرا گمان شکست کے صدمے سے دوچار تھا۔ ادب سے وابستگی میرے لیے ادبی دنیا کی تمام ہرگرمیوں سے واقفیت بھی رہی ہے اور اسے میرے لیے ادبی دنیا کی تمام سرگرمیوں سے واقفیت بھی رہے ہے اور اسے میرے صحافی بھی ہونے نے ایک منصبی فرض سا بنائے رکھا ہے۔ ایسے میں ایک اتنے اچھے اور صاحب طرز شاعر سے ناواقف ہونے کا کیا مطلب ہے۔ اس صورتحال کو سمجھنے کی غرض سے جاری تجزیہ کاری نے سمجھایا کہ اس کا سبب شاید فہمی صاحب کا ادبی رسالوں (خاص کر اہم اور نمایاں رسالوں) اور مشاعروں دونوں جگہ نہ آنا رہا ہو۔ وہ ان دونوں جگہوں پر ہوتے تو میری نظر سے اوجھل نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسے میں ایک یہی امکان باقی رہتا ہے کہ انہوں نے اپنی آواز کو تنہائی میں پروان چڑھانے کو ترجیح دیتے ہوئے رسالوں سے دوری اختیار کی ہو اور مشاعروں سے، مشاعرے باز شاعروں اور ناشاعروں کے ہاتھوں شاعری کی عصمت دری کے پیش نظر کنارہ کر لیا ہو یا یہ بھی کہ ان کی شاعری سے مناسبت رکھنے والی خواندگی اور سماعت ابھی راہ میں رہی ہو۔ پھر ہوا بھی یہی کہ یہ خواندگی اور سماعت، صدی کے ورق پلٹتے ہی سوشل میڈیا کے نام کے جن نے انہیں مہیا کرا دی۔ مذکورہ محفل میں ان سے ہونے والا تعارف مجھے تاریخ کے اسی عہد ساز موڑ پر حاصل ہوا تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ سوشل میڈیا نے جہاں اظہار اور بیان کو چند خاص اقتدار یافتہ طبقوں، حلقوں، افراد

کی اجارہ داری، ملکیت اور ناجائز قبضے سے رہائی دلائی، وہیں تنقیدی فہم وبصیرت کے خود عائد کردہ نظم و ضبط کے بند بھی کھول دیے، جس کے نتیجے میں دلوں اور دماغوں میں بند پڑا سارا کچرا باڑھ کے پانی کی طرح بہہ نکلا۔ ان دونوں مثبت اور منفی زمروں میں ان کی نوعیت کے منطقی تقاضوں کے مطابق نتیجے پیدا ہوئے۔ مثبت زمرے میں بہت سے سچے کھرے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی وہ شناخت حاصل کرنے کا موقع ملا جوان کا حق تھا اور دوسری طرف لچوں لفنگوں کا ایک وحشت زدہ ہجوم ادب کے ایوانوں کے دروازے توڑنے پر لگ گیا۔

فہمی بدایونی نے اس دیار میں قدم رکھے تو ایک کھلی، غیر مشروط اور پہلے سے بنی بنائی رایوں سے آزاد قبولیت ان کی منتظر تھی۔ اس قبولیت کا انتظار بہت جلد پورا ہوا اور پھر قبولیت دیکھتے ہی دیکھتے مقبولیت کی منزلیں سر کرنے لگی۔ فہمی بدایونی اس طرح ایک سپر اسٹار جیسی شخصیت میں تبدیل ہو گئے۔ ان کا شعری اسلوب سماعتوں پر ایک بجلی کی طرح گرا مگر یہ بجلی ایک بار چمک کر نہیں گئی بلکہ مسلسل اور مستقل ہوگئی۔ شعری معیار اور مقبولیت کا ایسا وصال ایک غیر معمولی ادبی واقعہ ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ ان کے (اور میرے بھی) ہم عمر شاعروں نے عوامی مقبولیت شاعری کے بنیادی اصولوں سے سمجھوتہ کر کے خود کو عام لوگوں کی پست ذوقی کی سطح تک اتار کر، فرقہ وارانہ جذبوں اور ہوس ناکی کی جبلتوں کو ہوا دے کر حاصل کی ہے۔ اس کے برعکس فہمی بدایونی نے یہ کامیابی اپنے اسلوب بیان اور اظہاری تکنیک کی مدد سے حاصل کی ہے۔

فہمی بدایونی کا طرز بیان سہل ممتنع کے شعری عمل کے نہایت ماہرانہ استعمال پر مبنی ہے۔ اس طرز کے شعر ہمارے سارے بڑے شاعروں نے برتا ہے۔ مومن خاں مومن کا یہ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سہل ممتنع کی مثالی صورت کے طور پر زباں زد خاص وعام ہے۔ اس طرز کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سہل ممتنع کا شعر وہ ہوتا ہے جس کے کسی بھی مصرعے کی نثر نہ کی جا سکے یعنی مصرعے کی نحوی ترتیب بالکل نثر جیسی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ سہل ممتنع کا شعر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی کہہ لے مگر کہنے پر آئے تو کہہ نہ سکے۔ اس طرز کے شعر گہرے اور شدید محسوسات کو فوری تاثر پیدا کرنے والے انداز سے مرتب کیا جاتا ہے یا کسی وجدانی عمل کے نتیجے میں واقع ہو جاتا ہے۔ اس طرز کے شعر ہمارے زمانے میں سب سے پہلے ایک اسلوب کے طور پر محمد علوی نے کہے تھے۔ اب فہمی بدایونی نے اسے اپنا بنیادی اسلوب ٹھہرایا ہے۔ لیکن انہوں نے سہل ممتنع میں، تضادی (Binaries) جوڑوں کی یکجائی کا مشاقانہ استعمال کر کے ایک نئی کاٹ پیدا کرنے کا کام بھی کیا ہے۔ متضادیات کی یکجائی کو اردو کی کلاسیکی شعریات میں صنعت تضاد کی اصطلاح کے طور پر نشان زد کیا گیا ہے۔ مگر یہ کوئی صنعت نہیں، بلکہ غزلیہ شاعری کی نوعی اور فطری فعلیت کا مدار ہے۔ اردو کے بہت سے بڑے شعر اسی متضادی یکجائی کا نتیجہ ہیں۔ فہمی صاحب نے اس تکنیک کو کثرت اور تواتر سے استعمال کیا ہے۔

رات بھی جب تمہارا فون آیا
تم ہمارے ہی پاس بیٹھے تھے

اچھا تو رات تم تھے پہلو میں
میں نے سمجھا کہ دوسرا ہیں تھا

میں تمہارے ہی ساتھ رہتا ہوں
تم مرے ساتھ کیوں نہیں رہتے

کچھ نہ کچھ بولتے رہو ہم سے
چپ رہو گے تو لوگ سن لیں گے

پہلے شعر میں تمہارا یعنی کسی معشوق یا دوست کا فون آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فون کرنے والا وہاں نہیں تھا جہاں فون وصول کرنے والا موجود تھا۔ دوسرے مصرعے میں کہا جا رہا ہے کہ تم (یعنی فون کرنے والا) ہمارے (متکلم یعنی وہ جو شعر کا راوی ہے) ہی پاس بیٹھے تھے۔ یہاں کسی شخص کے بہ یک وقت غیر موجود اور موجود ہونے کو ایک ساتھ لا کر ایک خوش گوار حیرت کا سا ماحول پیدا کیا گیا ہے۔ یہاں بیان کی گئی تکنیکیں ایک ساتھ کارفرما ہیں۔ سہل ممتنع تو ہے ہی، تضادات کی یکجائی بھی اور ان کے ساتھ ہی ایک حربہ اور بھی استعمال میں لایا گیا ہے جسے مشہور انگریزی شاعر اور نقاد سیموئل ٹیلر کالیرج نے بے یقینی کا ارادی التوا (Willing suspension of disbelief) کہا ہے۔ مطلب یہ کہ اس بات پر یقین کرنا تو ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی شخص، نہ ہوتے ہوئے موجود رہ سکتا ہے مگر شعر ہمیں مجبور کر دیتا ہے کہ اس بے یقینی کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دیں اور بے یقینی کا یہ بالارادہ التوا ہمیں حیرت اور خوشگواری کے تجربے سے گزارتا ہے۔ یہاں لطف کا پہلو شعر کو سمجھنے کے معاملے پر غالب آ جاتا ہے۔ بیشتر پڑھنے اور سننے والے (سننے والے زیادہ) شعر کو سمجھنے تک پہنچتے ہی نہیں (کہ ان میں یا تو اس کی صلاحیت نہیں ہوتی یا ارادہ یا ضرورت نہیں ہوتی) اور لطف لے کر آگے بڑھ جاتے ہیں، جبکہ ایک ذرا سا غور کرنے سے ہی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فون آنے کے وقت، فون وصول کرنے والے شخص نے فون کرنے والے کو اپنے تخیل کی مدد سے اپنے پاس بیٹھا ہوا محسوس کر لیا۔ اس طرح پہلا مصرع حقیقی اور دوسرا مصرع ایک تصوراتی حال بیان کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ فون کرنے والا متکلم کے پاس ہی بیٹھا ہو اور متکلم نے اپنے تصور میں اس کی کسی پرانی فون کال کو یاد کیا ہو۔

دوسرے شعر میں بھی غیر موجودگی اور موجودگی کی مقابلہ آرائی کا سماں ہے۔ متکلم یہاں وصال کی صورتِ حال بیان کرتے اپنے معشوق سے شکایت کر رہا ہے کہ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تم وعدہ کر کے نہیں آئے اور وصال کی رات میں نے اپنے ساتھ ہی تنہائی میں گزاری مگر جواب میں معشوق جو کچھ کہتا ہے اس پر متکلم کو حیرت ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ 'اچھا! وہ تم تھے۔' 'یہاں' میں نے سمجھا تھا دوسرا 'میں تھا' اور 'اچھا! تو رات تم تھے پہلو میں، دونوں ہی حالتیں تصوراتی ہیں مگر حقیقی معلوم ہوتی ہیں۔ تیسرے شعر میں بھی موجودگی اور غیر موجودگی کے تصادم کا تخلیقی استعمال کیا گیا ہے۔ متکلم کا یہ کہنا کہ 'میں تمہارے ہی ساتھ رہتا ہوں مگر، تم میرے ساتھ کیوں نہیں رہتے' ایک دلچسپ صورتِ حال پیدا کر رہا ہے کہ جب متکلم مخاطب کے ساتھ رہتا ہے تو مخاطب بھی تو اس کے ساتھ ہوا۔ یعنی دونوں یکجا ہیں تو پھر دوسرے مصرعے میں اس بات کا کیا مطلب کہ 'تم میرے ساتھ کیوں نہیں رہتے'، یہاں ظاہر ہے کہ حقیقی اور تصوراتی موجودگیاں آمنے سامنے ہیں، اس طرح کہ مخاطب ظاہر یا جسمانی طور پر تو ساتھ ہے مگر اندرونی یا جذباتی طور پر موجود نہیں ہے۔ چوتھا شعر چپ رہنے کو آواز کرنے سے تعبیر کر رہا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ متکلم اور مخاطب دونوں کسی ایک گھر میں کچھ لوگوں کے ساتھ موجود ہیں۔ دونوں کچھ دن پہلے شادی کے رشتے میں بندھے ہیں مگر پچھلی رات دونوں میں کچھ تلخ کلامی ہوئی ہے جس کے سبب مخاطب خاموش ہے۔ متکلم کا یہ کہنا کہ 'کچھ نہ کچھ بولتے رہو ہم سے' دراصل یہ کہنا ہے کہ بس یوں ہی کچھ بے معنی ہی سہی بولتے رہو کیوں کہ چپ رہو گے تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے درمیان کچھ کشیدگی ہے۔ چونکہ بولنے کے لیے مخاطب سے کہا جا رہا ہے، اس لیے شاید یہ دونوں مخاطب (جو شاید لڑکی ہے) کے گھر میں ہیں یعنی متکلم اپنی سسرال میں ہے اور نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی چپ رہ کر اپنے ناراض ہونے کا تاثر دے اور اسی طرح متکلم کو خجالت اٹھانی پڑے۔

فہمی بدایونی کے ہاں ایک اور شعر کارگزار بھی خاصی نمایاں ہے جیسے کلاسیکی شعریات میں پرانے مضمون (شعری صورت حال) میں کوئی نیا پہلو پیدا کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں روسی ہیئت پسندوں (formalists Russian) میں شامل ادبی ولسانی فکر ساز شکلافسکی نے اسے ناموس کاری (defamiliarization) کا نام دیا ہے۔ ناموس کاری سے مراد ایک ایسا ادبی متن (شاعری اور فکشن) بنانا ہے جس میں پہلے سے موجود جانے پہچانے مضمون (صورت حال)، خیالات اور جذبات ترتیب نو یا نئی تعبیر سے گذر کر نیا پن حاصل کر لیں۔

اس پس منظر میں یہ شعر دیکھیے:

ہم ترے غم کے پاس بیٹھے تھے
دوسرے غم اداس بیٹھے تھے

....

جیسے تیسے کسی پہ مرتا ہوں
زندگی نے جکڑ رکھا ہے مجھے

....

ہر کسی سے بچھڑنا پڑتا ہے
اب میں اپنے ہی پاس رہتا ہوں

....

ہمارا حال تم بھی پوچھتے ہو
تمہیں معلوم ہونا چاہیے تھا

....

جان میں جان آ گئی میری
دو کسی اور سے خفا نکلا

پہلے شعر میں غمِ عشق اور غمِ دنیا کے مضمون کو ایک نیا چہرہ دیا ہے اور اس طرح سے کہ یہ اندازہ لگانا آسان نہیں کہ کس بات کو کس انداز سے بیان کیا جا رہا ہے۔ ایک تو غم کی تجسیم کر کے ایک انسانی شکل دے دی گئی ہے جو 'دوسرے غم اُداس بیٹھے ہیں' کے زبردست پیکر کے ذریعے دونوں کے آپس میں روٹھنے اور منانے کی تصویر کشی کر رہی ہے۔ غموں کے اداس ہونے کا قول محال اس شعر کے پرلطف ہونے کی کلید ہے۔ اب تصویر یوں بنتی ہے کہ متکلم معشوق کے غم میں ڈوبا ہوا ہے تو اس پر دوسرے غموں یعنی دنیا اور زندگی کے غم منہ بسورے بیٹھے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں کہ 'یار آپ عجیب آدمی ہیں، آپ کے لیے محبت کا غم اتنا بڑا ہو گیا کہ ہماری کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔' اسی طرح کا ہی کچھ معاملہ دوسرے شعر میں بھی ہے مگر ترجیحات الٹ گئی ہیں۔ یہاں غمِ زندگی یعنی زندگی کے مسئلوں نے ایسا بے بس کر رکھا ہے کہ 'کسی پر مرنا' یعنی محبت میں مبتلا ہونا سخت مشکل ہو گیا ہے۔ 'زندگی' اور 'مرنا' کی رعایت کا لطف اپنی جگہ ہے۔ تیسرے شعر میں محبت یا دوستی میں جدائی، ترکِ تعلق، بے وفائی کے موضوع کو نئی ترتیب سے گذارا گیا ہے۔ یہاں 'بچھڑنا پڑتا ہے' کا فقرہ محبت، دوستی، عام انسانی تعلقات میں جدا ہونے کو ایک تقدیری صورتِ حال کا جبر قرار دیتا ہے جس کے ردعمل میں متکلم کو دوسروں کے بجائے بس اپنے آپ سے متعلق رہنے کا فیصلہ کرنا پڑا ہے۔ چوتھا شعر محبت یا کسی بھی گہرے تعلق، جس میں ایک دوسرے کے خیال اور ایک دوسرے سے باخبر رکھنا فطری طور پر لازمی ہے، سوالیہ نشان تو لگاتا ہی ہے، محبوب یا دوست کو شرمندہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آخری شعر محبوب یا دوست کے ناراض ہونے کی صورت کو شدید ڈرامائی انداز سے پیش کرتا ہے۔ محبوب یا دوست سخت ناراض ہے، چہرہ سرخ ہو رہا ہے، تیوریاں چڑھی ہوئی ہیں، ایک پتھریلی خاموشی

طاری ہے اور عاشق یا دوست کی جان پر بنی ہوئی ہے، طرح طرح کے اندیشوں نے گھیر لیا ہے، خاص طور پر اس بات سے کہ محبوب یا دوست ناراض ہے تو کیوں اور کس بات پر؟ ایسے میں اچانک وہ شدید غصے میں بولتا ہے کہ 'جی چاہتا ہے اس کا منہ توڑ دوں، زبان کاٹ دوں، اور یہ سنتے ہی عاشق یا دوست کی جان میں جان آجاتی ہے کہ وہ تو کسی اور سے خفا ہے۔

فہمی صاحب نے بیان کے کئی اور طریقے بھی اختیار کیے ہیں مثلاً شعر کو صرف ایک حرکی پیکر پر قائم کرنا۔ یہ بے مثال شعر جس سے عنوان کا مصرع لیا گیا ہے:

ٹہلتے پھر رہے ہیں سارے گھر میں
تری خالی جگہ کو بھر رہے ہیں

اسی صورتِ حال کی صورت گری کر رہا ہے۔ کوئی محبوب یا عزیز چلا گیا ہے، ہمیشہ کے لیے یا عارضی طور پر، اور گھر خالی خالی لگ رہا ہے، اور اس خالی جگہ کو سارے گھر میں ٹہل کر بھرا جا رہا ہے۔ ٹہل اس لیے رہے ہیں کہ زبردست اضطراب ہے جو بے چینی میں ہونے والا ایک فطری عمل ہے۔ ٹہلنے کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ محبوب یا عزیز کے چلے جانے سے جو فاصلہ پیدا ہوا ہے اسے طے کیا جائے، تصوراتی طور پر ہی سہی، اس پورے عمل میں ایک استعاراتی پہلو بھی دیکھا جاسکتا ہے اگر گھر سے دنیا یا کائنات مراد لی جائے اور اس کا خالی ہونا کسی قدر، کسی شکل یا تصور کا بچھڑ جانا سمجھا جائے اور ٹہلنے کو عملی جدوجہد سے تعبیر کیا جائے۔

ایسے بے شمار تخلیقی کمالات اس کتاب میں بھرے پڑے ہیں جن پر بات چیت اس تعارفی تحریر میں ممکن نہیں۔ آپ تو بس اس کتاب کو پڑھیں، بار بار پڑھیں، سر دھنیں اور میر کے یہ لفظ دبے لفظوں میں دہراتے رہیں کہ:

اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

جناب فہمی بدایونی کے چند اشعار

عید کے روز ہم پھٹی چادر
پچھلی صف میں بچھا کے بیٹھ گئے

ایک آہٹ پہ ہم کواڑوں تک
دوڑتے آئے رینگتے لوٹے

شہر کا شہر خوب صورت ہے
آپ کیا ہر مکاں میں رہتے ہیں

ایسے لگتا ہے اک دوپٹے سے
مری دستار ہار جائے گی

اگر جنگل میں جائیں تو درندے
ہمیں انسان کہہ کر چھیڑتے ہیں

ہمارا حال تم بھی پوچھتے ہو
تمہیں معلوم ہونا چاہیے تھا

کاش وہ راستے میں مل جائے
مجھ کو منہ پھیر کر گزرنا ہے

توڑے جاتے ہیں جو شیشے
وہ نوکیلے ہو جاتے ہیں

ہے مریضوں میں تذکرہ میرا
آزمائی ہوئی دوا کی طرح
جس کی خاطر چراغ بنتا ہوں
گھورتا ہے وہی ہوا کی طرح

گلوں کی باتیں چھپ کر سن رہا ہوں
تمہارا ذکر اچھا لگ رہا ہے

سنو لوگوں کو یہ شک ہو گیا ہے
کہ ہم جینے کی سازش کر رہے ہیں

بہت کہتی رہی آندھی سے چڑیا
کہ پہلی بار بچے اڑ رہے ہیں

ترے موزے یہیں پر رہ گئے ہیں
میں ان سے اپنے دستانے بنا لوں

پیاسے بچے کھیل رہے ہیں
مچھلی مچھلی کتنا پانی

یار تم کو کہاں کہاں ڈھونڈا
جاؤ تم سے میں بولتا ہی نہیں

اس کو لے کر چلی گئی گاڑی
پھر ہمیں کچھ نہیں دکھائی دیا

کچھ نہ کچھ بولتے رہو ہم سے
چپ رہو گے تو لوگ سن لیں گے

مجھ کو اپنا نہیں سمجھتے لوگ
میں اگر ?بکا نہیں ہوتا

فضول اور فالتو باتوں کا مطلب
محبت کرنے والے جانتے ہیں

میں اپنا سر بچاتا پھر رہا ہوں
مگر دستار کو اپنی پڑی ہے

آپ رکھتے تھے جب خیال مرا
غیر بھی پوچھتے تھے حال مرا

ڈر بھی لگتا ہے بات کرتے ہوئے
وہ بری ہی ہوئی تو کیا ہوگا

پہلے لگتا تھا تم ہی دنیا ہو
اب یہ لگتا ہے تم بھی دنیا ہو

علامہ محمد اسد (۱۹۰۰ء.....۱۹۹۲ء)

فقیر اللہ خاں/نیویارک

(یہودیت سے اسلام قبول کرنے کا ایمان افروز سفر)

(شاہ فیصل اور علامہ اقبال کا دوست کس طرح اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفارت کار کے عہدہ پر فائز ہوا)

(سعودی عرب کے شاہ اسد کو منہ بولا بیٹا کہا کرتے تھے)

محمد اسد ایک مصنف، مسلم مفکر، سفیر، مہم جو اور قرآن و حدیث کا مترجم تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے سفر کو جب صفحہ قرطاس پر رقم کیا تو اس مقدس سفر کو ''روڈ ٹو مکہ'' کا نام دیا۔ افسوس کہ مسلم امہ میں محمد اسد کو وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کا وہ اہل تھا۔ جن لوگوں نے محمد اسد کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ ہمارے اس دور میں اسد نے اسلام کو سمجھنے، سمجھانے اور خواب غفلت سے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں جس حد تک سعی کی ہے، یہ سعادت بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے۔

محمد اسد 1900ء میں پولینڈ کے شہر لووو میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ پولینڈ اُس وقت آسٹریا کے زیر نگیں تھا۔ اسد کا دادا یہودی مذہب کا عالم اور فقیہ تھا، جس کو یہودی مذہب میں ربی کہا جاتا ہے اور یہ سلسلہ ان کے خاندان میں کئی نسلوں سے چلا آ رہا تھا، لیکن اس کے برعکس اسد کا باپ پیشہ کے لحاظ سے اپنے علاقے کا مشہور بیرسٹر تھا۔ جب اسد کی عمر 13 سال تھی تو اُس کا خاندان وی آنا منتقل ہو گیا۔ اس ابتدائی عمر میں بھی اسد عبرانی زبان روانی سے بول سکتا تھا۔ اسد سکول میں داخل تو ہوا لیکن سکول کی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر اُس نے آسٹریا کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی اور اپنے ملک کی طرف سے جنگ عظیم اوّل میں حصہ لیا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد اسد وی آنا واپس آ گیا اور وی آنا کی یونیورسٹی میں فلسفہ اور ہسٹری کی تعلیم حاصل کرنے لگا، لیکن یہ تعلیم اسد کے اندرونی تلاطم کو وہ سکون نہ پہنچا سکی جس کا وہ متلاشی تھا۔ باوجودیکہ وی آنا ان دنوں تمام یورپ میں علم و فنون کا ایک اہم مرکز تصور کیا جاتا تھا، لیکن وی آنا کے بلند و بالا روشنی کے مینار بھی اسد کو وہ روشنی نہ دکھا سکے جو اس کے قلب اور رگ و پے کو منور کر سکے۔

اسد نے 1920ء میں وی آنا کو خیرباد کہا اور یورپ کے مشہور شہر برلن چلا آیا۔ برلن میں اُس نے اپنی زندگی کی گاڑی کو رواں رکھنے کے لیے کئی چھوٹے بڑے کام کیے۔ آخر اُس نے برلن کے ایک اخبار میں ٹیلیفون آپریٹر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ جس کا کام فون کے ذریعے فیلڈ کے رپورٹوں سے خبریں وصول کر کے اخبار کے ایڈیٹر تک پہنچانا تھا۔ اُنہی دنوں اسد کو پتہ چلا کہ روس کے مشہور زمانہ ادیب میکسم گورکی کی بیگم یورپ کے مختصر دورے پر ہے، جس کا مقصد روس کے لیے مالی امداد حاصل کرنا تھا۔ اسد نے موقع غنیمت جانا اور رات کے اندھیروں میں جا کر ہوٹل میں میکسم گورکی کی بیگم کا انٹرویو کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اگلی صبح اُس کے اخبار میں وہ انٹرویو چھپا تو اخبار کے ایڈیٹر نے اس کی اس کوشش کو بے حد سراہا اور اس کی اس کاوش کو خراج تحسین پیش کیا۔ بعدازاں 1922ء میں اسد اپنے چچا کی دعوت پر یروشلم آ گیا۔ یروشلم میں اپنے چچا کے ساتھ رہتے ہوئے اسد کا وہاں کی مرکزی صیہونی کمیٹی سے تعلق بھی رہا، لیکن اسد کا عربوں کے ساتھ ہمدردی اور ذہنی جھکاؤ کی وجہ سے اسد کو اس کمیٹی سے نکال دیا گیا۔ اس عمل سے اسد کو ایک یہودی ہونے کے ناطے دل کو گہری ٹھیس پہنچی اور یہودیت کے متعلق اُس کے دل میں نفرت کی چنگاری سلگنے لگی۔

اس کی فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے اس کے رگ و پے میں شمع اسلام کی کرنیں سرائیت کرنے لگیں اور آہستہ آہستہ اُس کا قلب اسلام کی طرف راغب ہوتا چلا گیا۔ ایک دن اسد نے صیہونی تحریک کے لیڈر سے سوال کیا کہ فلسطین کے مسلم اکثریتی والے علاقہ میں یہودی کس طرح اپنا غالب اثر رکھ سکتے ہیں۔ جبکہ فلسطین مسلمانوں کا حصہ ہے۔ اسد کے اس سوال سے یہودی لیڈر بہت ٹپٹایا اور اس نے اسد کو جواب دیا کہ ایک دن تو دیکھے گا کہ کچھ عرصہ بعد مسلمان اکثریت میں نہیں رہیں گے۔ اس غیر متوقع جواب سے اسد کو بہت ٹھیس پہنچی۔ کیونکہ اس لیڈر کا جواب مبنی برحقیقت نہیں تھا اور اسد نے سوچا کہ عربوں کی زبردست مخالفت کے باوجود یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

یروشلم میں رہتے ہوئے اسد نے اہل اسلام کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی تمدنی زندگی اور رسم و رواج کا بغور مطالعہ کیا۔ اس سے اسد کے دل میں اسلام کے متعلق گہری دلچسپی پیدا ہوتی چلی گئی اور اُس کا دل دن بدن اسلام کی طرف راغب ہوتا چلا گیا اور جب اس نے جرمنی کے مشہور اخبار فرینکفورٹ Frank furt Zeiting کو بحیثیت ایک رپورٹر اور صحافی جائن کیا تو اس نے اپنی صحافی ذمہ داریوں کے پیش نظر مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کا سفر کیا اور وہاں پر دوران قیام اہل عرب اور صحرائی بدوؤں کے درمیان

رہ کر ان کی اسلامی زندگی کے شب و روز کا گہرا مشاہدہ کیا۔ انہی ایام میں دورانِ قیام اس نے مسلمانوں کی تنزلی کا تنقیدی پہلو سے بھی جائزہ لیا۔ ان دنوں اہل عرب قبائلی چپقلش کی دلدل میں باہمی دست و گریباں تھے اور غیر ملکی طاقتیں مسلمانوں ہی کے میر جعفروں اور میر صادقوں کی وجہ سے انہی کی زمینوں پر قابض ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں کی کمزوریوں کی وجوہات کا جائزہ لینے کے لیے اس نے قرآن جو کہ مسلمانوں پر نازل ہوا تھا، کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا۔ کیونکہ کئی سال عربوں کے درمیاں رہتے ہوئے اسد نے عربی زبان پر کافی عبور حاصل کر لیا تھا، اس لیے اُسے عربی زبان اور قرآن کے مفہوم کو سمجھنے میں چنداں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا جس طرح ایک غیر عرب کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسد کی اس قابلیت نے بعد میں اس کو اس قابل بنایا کہ وہ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوا اور اس ترجمے کا نام اس نے ''قرآن کا پیغام'' Message of Quran رکھا۔

قرآن کو زیرِ مطالعہ رکھتے ہوئے اسد کو یہ بات عیاں ہوئی کہ مسلمانوں کے زوال کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ اسلام میں کوئی کمی ہے بلکہ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمانوں کا طرزِ زندگی قرآنی اصولوں کے مطابق نہیں۔ مسلمانوں نے اسلام کو مضبوط اور عظیم نہیں بنایا بلکہ درحقیقت اسلام نے ہی مسلمانوں کو عظیم اور طاقتور بنایا ہے اور قرآن سے دوری ہی مسلمانوں کے تمدنی اور اخلاقی انحطاط کا باعث ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اسد کی زندگی کا مقصد اور محور ٹھہرا۔ اس نیک مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسد نے دنیائے اسلام کا وسیع و عریض سفر کیا۔ اس نے بادشاہوں سے دوستی بھی کی اور اپنے دل کی تشفی کے لیے کئی لوگوں سے بحث بھی کی۔ وہ ہر خاص و عام کو ملا۔ لیبیا اور سعودی عرب کے صحراؤں سے لے کر بحرۂ اسود، بحرہ عرب اور پامیر کی پہاڑیوں کو بھی اپنے قدموں تلے روندا اور اس سارے سفر کی روداد کو اس نے بعد میں 'کراس روڈ ٹو اسلام' Cross Road to Islam میں بلند کیا، جس کی اشاعت 1934ء میں منظرِ عام پر آئی۔

جب جرمنی کے اخبار 'فرینکفرٹ زیتونگ' Frank Furt Zeituns میں بحیثیت رپورٹر اسد کو مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں تعینات کیا گیا تو بحرۂ روم عبور کرنے کے بعد اس کا پہلا پڑاؤ مصر کے شہر قاہرہ میں تھا، جہاں پر اس نے عربی زبان کو باقاعدہ عربی زبان کے اساتذہ سے پڑھا اور جامعۃ الازہر کے شیخ مصطفیٰ فراغی کی رفاقت میں اسلام کے متعلق حقیقی معنوں میں آگاہی حاصل کی۔ بعدازاں وہاں سے شام، سعودی عرب، عراق، ایران اور افغانستان میں گھومتا ہوا اپنی اخباری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اسلام سے بھی مکمل آگاہی حاصل کرتا رہا۔ وہ کابل، قندھار اور ہرات کے سفر کے بعد 1926ء میں سمرقند بخارا اور پولینڈ کے راستے سیدھا جرمنی میں اپنے اخبار کے دفتر فرینکفرٹ آ گیا۔ جہاں سے اُسے اگلی ذمہ داری برلن کی ایک اکیڈمی میں لیکچر دینے کی سونپی گئی۔

قبولِ اسلام کا واقعہ

انہی ایام میں برلن میں اسد کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا جس نے اس کی دنیا ہی کو بدل ڈالا۔ اسد بیان کرتا ہے کہ ایک شام میں اپنی بیوی ایلسا کے ہمراہ برلن کی انڈر گراؤنڈ ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ میرے سامنے کی نشست پر ایک جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ لباس ہیرے کی انگوٹھیوں اور ظاہری وضع قطع سے وہ لوگ بڑے خوش حال اور متمول نظر آ رہے تھے لیکن جب میں نے ان کے چہرہ پر نگاہ ڈالی تو مجھے ان کے چہروں پر حقیقی خوشی اور طمانیت کے آثار نظر نہ آئے اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے مایوسیوں اور محرومیوں نے ڈیرہ ڈالا ہوا ہے۔ میں نے گاڑی کے پورے ڈبے میں نظر دوڑائی، مگر وہ شخص جو بظاہر کروڑ پتی نظر آ رہا تھا، کے چہرے پر ایک انجانے غم کی جھلک نمایاں تھیں۔ ہم گھر واپس آئے اور میری نگاہ میز پر پڑی تو اس پر قرآن کا نسخہ پڑا تھا جو اکثر میرے مطالعہ میں رہتا تھا۔ میں نے اُسے بند کر کے الماری میں رکھنا چاہا تو معاً میری نگاہ سامنے سے پہلے سے کھلے صفحہ پر پڑ گئی۔ قرآنی آیات میری نظر کے سامنے تھیں اور لکھا تھا:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ...... الخ

سورہ ترجمہ: ''تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اُس فکر میں تم لوگ قبروں تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ پھر سن لو کہ ہرگز نہیں۔ اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے جانتے ہوتے (تو تمہارا طرزِ عمل یہ نہ ہوتا) تم جہنم دیکھ کر رہو گے۔ پھر سن لو کہ تم بالکل یقین کی آنکھ سے اُسے دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اُس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔'' (سورہ التکاثر)

علامہ اسد فرماتے ہیں ''میں آیات قرآنی پڑھ کر بالکل گم صم ہو گیا۔ میں نے اپنی بیوی کو آواز دی اور کہا کہ دیکھو یہ اُس کا جواب نہیں جو گزشتہ رات ہم نے ٹرین میں دیکھا۔ ہم نے سوچا کہ یہ کتاب اللہ ہی کی طرف سے نازل کردہ ہے اور مجھے یقین آ گیا کہ قرآن کسی انسان کی حکمت و دانائی کا تحریر کردہ نہیں۔ انسان خواہ کتنا ہی عقلمند، صاحب فہم و فراست ہو، وہ اس عذاب کی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ دوسرے ہی روز

میں برلن میں مسلمانوں کی ایک انجمن کے صدر جو کہ ہندوستانی تھا، کے پاس جا کر صدقِ دل سے اسلام قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے کلمہ شہادت پڑھایا اور بولے کہ آپ کا پہلا نام لیوپولڈ (Leopuld) ہے اور یونانی زبان میں لیوشیر کو کہتے ہیں اور ہم آپ کو آج سے لیوپولڈ نہیں بلکہ محمد اسد کہیں گے اور اس دن اسلام قبول کرنے کے چند دن بعد ہی میری بیوی ایلسا نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ پھر ہم مصر کے راستے سعودی عرب حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے چلے گئے۔''

اسد کے اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے باپ سے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور اسد نے اخبار سے ملازمت بھی ختم کر لی۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے 9 دن بعد ہی اُس کی بیوی ایلسا کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اُس کا قیام مکہ ہی میں رہا۔ ایک دن بڑی لائبریری میں اسد کی ملاقات شاہ عبدالعزیز کے بیٹے شہزادہ فیصل بن عبدالعزیز سے ہوئی۔ شہزادے نے سعودی عرب کے فرماں روا اپنے والد شاہ عبدالعزیز کی طرف سے اسد کو ملاقات کی دعوت پہنچائی۔ شاہ سے پہلی ملاقات کے بعد یہ ملاقاتیں روزانہ کا معمول بن گئیں۔ اسد نے 1927ء سے 1932ء تک چھ سال مکہ اور مدینہ میں گزارے۔ جہاں پر اُس نے قرآن و حدیث، سیرت رسولؐ اور اسلامیات کا دلجمعی سے گہرا مطالعہ کیا اور کئی جید علماء وقت سے کسبِ فیض حاصل کیا۔ اس وسیع مطالعہ سے اسد کے اندر ایمان اور دین اسلام کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئیں۔

یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ 20 سال بعد اسد 1952ء میں ایک پاکستانی پارلیمانی وفد کے ہمراہ سعودی عرب پہنچا تو اس وفد کا نہایت والہانہ استقبال کیا گیا۔ اس وفد کی سربراہی پاکستان کی قومی اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیزالدین کر رہے تھے، لیکن اس وفد کو جو اعزاز سعودی عرب کی شاہی حکومت کی طرف سے دیا گیا وہ صرف اسد کے سعودی شاہ سے دیرینہ مراسم اور قربت ہی کی وجہ سے تھا۔ جس کو شاہ اپنا منہ بولا بیٹا کہا کرتے تھے۔

علامہ اقبال سے ملاقات

مسلمانوں کے کلچر اور دوسرے مکتبہ فکر کے لوگوں سے ملنے کے لیے اسد نے بلادِ مشرق کا سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں 1932ء میں وہ کراچی کے راستے ہندوستان میں وارد ہوا۔ وہاں پر اُس کی ملاقات لاہور میں فلاسفر، محقق اور وقت کے عظیم شاعر علامہ اقبال سے ہوئی اور یہ پہلی ملاقات دن بدن گہری دوستی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ علامہ اقبال جو برصغیر میں مسلمانوں کے ایک علیحدہ وطن کے خواب کی تعبیر پانے میں مصروفِ عمل تھے، اسد کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مشرق میں چین، ملایا اور انڈونیشیا جانے کا پروگرام ملتوی کر دے اور یہاں مستقبل کی اسلامی ریاست کے لیے اسلامی آئین و قوانین بنانے میں اسلامیانِ ہند کا ہاتھ بٹائے، لیکن جب جنگِ عظیم دوم کا آغاز ہوا تو اسد اس وقت انڈیا ہی میں قیام پذیر تھا۔ اس کے ایک آسٹرین باشندہ ہونے کے ناطے جنگِ عظیم دوم شروع ہونے کے دوسرے ہی دن اسد کو مشرقی پنجاب کے شہر ڈلہوزی میں نظر بند کر دیا گیا۔ انڈیا میں جن 300 غیر ملکی باشندوں کو نظر بند کیا گیا ان میں صرف اسد ہی واحد مسلمان تھا۔

اللہ کے فضل سے جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اسد پاکستان چلا آیا اور نئی حکومت نے اسے مملکت اسلامیہ کی بنیادی اور نظریاتی حدود متعین کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ بعدازاں اسے وزارت خارجہ میں مڈل ایسٹ ڈویژن کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ اسد نے مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات مزید بہتر بنانے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسد کو پہلی مرتبہ پاکستانی پاسپورٹ وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں کی خصوصی ہدایت پر جاری کیا گیا۔ جبکہ پہلے ہی اسد کے دل میں پاکستانی قومیت اختیار کرنے کی خواہش مچلتی رہتی تھی۔ بعدازاں جب اسے سعودی عرب کی قومیت کی پیشکش کی گئی تو اس نے نہایت احسن طریقہ سے انکار کر دیا اور جواب میں کہا کہ مملکت خدادادِ پاکستان صرف اور صرف اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا اور وہ بذاتِ خود سمجھتا ہے کہ ہر مسلمان پاکستانی ہے۔ اس بات کا اظہار اُس نے 1980ء میں ایک ٹی وی انٹرویو میں کیا۔

یہ سعادت بھی اسد ہی کے حصہ میں آئی کہ اس نے آئین پاکستان کا سرنامہ (Preamble) لکھا جو بعد میں آئین پاکستان کا حصہ بنا۔ اسد اسلام میں حقوق نسواں کا زبردست حامی تھا۔ اسد ہی کے اسرار پر آئین پاکستان میں عورتوں کے حقوق کی شق کا اضافہ کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ایک عورت بھی مردوں کے برابر الیکشن میں حصہ لے سکتی ہے اور اسی قانون کے تحت ہمارے ملک میں محترمہ فاطمہ جناح نے 1964ء میں جنرل ایوب خان کے مقابلہ میں صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اور محترمہ بےنظیر بھٹو بھی دو دفعہ وزارتِ عظمیٰ کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہیں۔

1952ء کے اوائل میں اسد کو اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب کے اہم عہدہ پر تعینات کیا

گیا۔ اس نے اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو اپنی سفارتی اسناد پیش کرتے وقت سر پر جناح کیپ اور اچکن زیبِ تن کی ہوئی تھی۔ کیمرے کی آنکھ نے یہ منظر دیکھا ہی ہوگا لیکن تاریخ نے ایسے مناظر بہت کم دیکھے ہوں گے کہ ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہونے والا ایک یورپی نژاد آج اقوامِ متحدہ کی شاندار عمارت میں اس ملک کی نمائندگی کرنے کے لیے داخل ہو رہا ہے جو صرف اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا۔

شادی

اقوامِ متحدہ کی تعیناتی کے دوران اسد کی ملاقات ایک نومسلم خاتون پولا حمیدہ (Pola Hamida) سے ہوئی جو بوسٹن کی رہنے والی تھی اور کچھ عرصہ قبل ہی وہ مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی۔ اسد نے حکومت پاکستان سے مروّجہ قوانین کے مطابق غیرملکی خاتون سے شادی کی پیشگی اجازت طلب کی، لیکن سابقہ روایات کے مطابق یہاں بھی بیوروکریسی آڑے آئی اور انہوں نے اسد کو ایک غیرملکی خاتون سے شادی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس انکار سے اسد بہت دل برداشتہ ہوا اور اس نے حکومت پاکستان کی سروسز سے استعفیٰ دے دیا اور اس کے بعد اسد نے پولا حمیدہ سے شادی کر لی۔ وہ دو سال تک نیویارک ہی میں مقیم رہا۔

روڈ ٹو مکہ (Road to Mecca)

یہی وہ وقت تھا جب اسد نے اپنی زندگی کے سفر کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کے لیے اس کہانی کا آغاز کیا جو کتابی شکل میں روڈ ٹو مکہ (Road to Mecca) کے نام سے شائع ہوئی۔ اس نے یہ کتاب قیامِ نیویارک کے دوران دو سال میں مکمل کی اور اس کتاب کو اپنے دیرینہ دوست شاہ فیصل شہید کے نام معنون کیا۔ اب تک اس کتاب کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ کتاب اپنے وقت کی Best Selling book شمار کی جاتی ہے۔

روڈ ٹو مکہ کہانی ہے ایک ایسے انسان کی جس کے اندر بے چینی، مایوسی کے احساسات و جذبات کے علاوہ خوشی اور غم کا امتزاج جھلکتا ہے۔ جو کسی سکون کی تلاش میں بستی بستی، نگر نگر، قریہ قریہ، شہر شہر کبھی ایک ملک کبھی دوسرے ملک میں اپنے اپنے گوہرِ مقصود کو حاصل کرنے کے لیے صحراؤں، بیابانوں یہاں تک کہ شاہوں کے محلات میں بھی مارا مارا پھرتا ہے اور بالآخر اس بے چین مسافر کی روح کو قرار اُس وقت ملتا ہے جب وہ اسلام کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو اس کو اندر سے مرحبا اور اہلاً وسہلاً کی صدائیں سنائی دیتی ہیں اور وہ بے ساختہ اپنے آپ کو آغوشِ مادر اور گوشۂ عافیت میں پاتا ہے۔

دی میسیج آف دی قرآن

(Message of the Quran)

نیویارک کے قیام میں 'روڈ ٹو مکہ' مکمل کرنے کے بعد اسد نیویارک سے مراکش اور پرتگال سے ہوتا ہوا اسپین میں مقیم ہو گیا اور 80 برس کی عمر تک بھی قلم و کاغذ کا رشتہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ اس نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ The message of Quran 1964ء میں مکمل کیا۔ جو ترجمہ کے علاوہ تفسیر پر مشتمل ہے۔ اسد نے صحیح البخاری کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اسد کو ''دی میسیج آف قرآن'' کی اشاعت کے بعد تقسیم کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس مشکل وقت میں سعودی عرب کے وزیر پٹرولیم شیخ احمد ذکی یمانی آگے بڑھے اور انہوں نے بیس ہزار کا پیاں خرید کر تقسیم کیں۔ اسی طرح اپنی وفات سے پانچ سال قبل تک محمد اسد تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہا۔

سفرِ آخرت

اپنی زندگی کے آخری ایام میں محمد اسد اپنی بیوی پولا حمیدہ کے ہمراہ سپین کے مشہور شہر غرناطہ میں مقیم ہو گیا۔ جس طرح کہا جاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑھاپا ایک ایسا مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ بالآخر 91 برس کی عمر میں محمد اسد نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اسے غرناطہ ہی میں مسلمانوں کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اُس نے 20 فروری 1992ء کو وفات پائی۔

صدر ضیاء الحق نے 1982ء میں محمد اسد کو اسلامی قوانین میں مشاورت کے ضمن میں پاکستان آنے کی دعوت دی لیکن وہ چند یوم قیام کر کے واپس چلا گیا۔ اسد کی بیوی پولا حمیدہ کے الفاظ میں ''اسد کو پاکستان سے خصوصی محبت اور ایک قلبی لگاؤ تھا۔ انہیں پاکستان دل و جان سے عزیز تھا۔ وہ تصورِ پاکستان سے محبت کرتے تھے۔'' حالانکہ بعض لوگوں نے ان کے ساتھ معاندانہ رویہ اپنایا لیکن وہ کبھی اس طرزِ سلوک کے شاکی نہ رہے۔

حکومتِ پاکستان کے لیے خدمات:

محمد اسد کو 14 اگست 1947ء کو ہی پاکستان کی شہریت مل گئی۔ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب کے علاوہ اس نے کئی اہم ذمہ داریاں نبھائیں۔ وہ وزارتِ مذہبی امور کا ڈائریکٹر، وزارتِ خارجہ میں مڈل ایسٹ ڈویژن کا ڈپٹی سیکرٹری بھی رہا۔

محمد اسد ایسا انمول ہیرا تھا، جس کو پاکستان کی روایتی بیوروکریسی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

خواہ مخواہ کے شعری اوزان

احمد ندیم رفیع/امریکا

حال ہی میں ایک غزل لکھتے ہوئے ایک لفظ خواہ مخواہ شعر میں در آیا۔ جی ہاں! میں لفظ "خواہ مخواہ" ہی کی بات کر رہا ہوں۔ سوال یہ اٹھا کہ اوزان میں خوامخواہ کا درست استعمال کیا ہوگا۔

لفظ خواہ مخواہ پر تھوڑی بہت تحقیق کی تو اندازہ ہوا کہ اردو شاعری میں یہ مرکب لفظ دو طرح سے لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ خواہ مخواہ اور خوامخواہ۔ خوامخوا کا لفظ صرف ریختہ ڈکشنری میں نظر آیا جبکہ زیادہ تر لغت میں خواہ مخواہ ہی لکھا ہوا ملا۔ جس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔

غلط املا: خامخواہ/خوامخواہ/خواہ مخوا

صحیح املا: خواہ مخواہ

فیروز اللغات کو دیکھا تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خواہ مخواہ کا ماخذ فارسی کا لفظ خواہ ہے جس کے معنی' چاہے، چاہو، خواہش، درخواست، اور چاہ' کے ہیں۔ اور خواہ (لاحق فاعلی) فارسی لفظ خواستن مصدر کا صیغۂ امر جو کسی اسم کے بعد آ کر اسے اسمِ فاعل بنا دیتا ہے اور چاہنے والا کے معنی دیتا ہے۔ جیسے خیر خواہ۔ اسی طرح سے کچھ دوسرے الفاظ اخذ ہوتے ہیں جیسا کہ خواہ نخواہ اور خواہی نخواہی۔ منطقی طور پر خوانخواہ (چار و ناچار، طوعاً کرہاً) کی تو سمجھ آتی ہے لیکن خوانخواہ کی بجائے خواہ مخواہ کیونکر روزمرہ کی زبان کا حصہ بن گیا، اس بات کا جواب مجھے کہیں نہیں مل سکا۔ خواہ مخواہ کے کچھ اور معانی جو مختلف لغت میں نظر آئے وہ کچھ یوں تھے: مجبوراً، بلاوجہ، بے ضرورت، بے کار، ضرور، یقینی طور پر، بہرحال،

بہرصورت، لامحالہ، بے ساختہ، خود بخود، بغیر کسی تحریک یا خواہش کے، طبعاً، عادتاً وغیرہ

اساتذہ کا کلام بغور دیکھا تو ایک بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ اس مرکب لفظ کے دونوں حصوں میں حرف واؤ ساکن ہے یعنی پڑھنے میں

۱-خوامخواہ کا تلفظ خامخاہ ہوگا

۲-خواہ مخواہ کا تلفظ خاہ مخاہ ہوگا

جیسا کہ خواب کا تلفظ خاب اور خواہش کا خاہش ہوتا ہے۔ اوزان کے پیمانے پر پرکھا تو لفظ خواہ مخواہ کی ممکنہ افاعیل کچھ یوں بنتی نظر آئیں۔

خامخاہ (فاعلان)

خامخا (فاعلن)

خاہ مخاہ (فعل فعول)

خاہ مخا (فعل فعَل)

اب دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ خامخاہ کا آخری ہ اور خاہ مخاہ کے دونوں ہ (ہائے ہوز) شعری پیمانوں پر ساکن ہونگے یا شعری ضرورت کے تحت متحرک بھی ہو سکتے ہیں یعنی اپنی پوری آواز کے ساتھ استعمال ہو گے۔ اس سلسلے میں مختلف شعرا کے ہاں لفظ خواہ مخواہ کے استعمال پر غور کرنا شروع کیا تو کافی مختلف صورتیں نظر آئیں۔

میر تقی میر (1723-1810) کی غزل کے دو اشعار دیکھیے

جز جرم عشق کوئی بھی ثابت کیا گناہ
ناحق ہماری جان لی اچھے ہو واہ واہ
گر منع مجھ کو کرتے ہیں تیری گلی سے لوگ
کیوں کر نہ جاؤں مجھ کو تو مرنا ہے خواہ مخواہ

ان شعروں میں خواہ مخواہ کا پہلا ہ تقطیع میں ساقط ہو جاتا ہے جبکہ آخری ہ اپنی پوری آواز کے ساتھ استعمال ہوا ہے کیونکہ وہ ردیف کا لازمی جزو ہے۔ میر کا ایک اور شعر دیکھیے۔ اس شعر میں بھی پہلا ہ ساکن اور دوسرا ہ متحرک ہے۔

جیتے جی میرے لینے نہ پاوے تپش بھی دم
اتنی تو سعی تو بھی جگر خواہ مخواہ کر

نظیر اکبرآبادی (1735-1830) نے بھی خواہ مخواہ کو اسی طرح استعمال کیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خواہ کا ہ اب تک ہر مثال میں غیر متحرک ہے۔

قاضی ، وکیل ، آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ
جب خوب رو پہ آن کے پڑتا ہے دن سیاہ
پھرتا ہے بوسے دیتا ہے ہر اک کو خواہ مخواہ

صفی اورنگ آبادی (1893-1954) کا ایک شعر دیکھیے:

خدا سمجھ لے لگانے بجھانے والوں کو
یہ خواہ مخواہ یہاں میں وہاں میں رہتے ہیں

یہاں بھی خواہ مخواہ بروزن خامخاہ استعمال ہوا ہے یعنی آخری ہ پوری طرح متحرک ہے

شاد دہلوی (1889-1964) کا ایک شعر ہے

شاد رکھنے کے آپ ضامن ہیں
فکر میں خواہ مخواہ کرتا ہوں

یہاں تک تو خواہ مخواہ کا استعمال بروزن خامخاہ (فاعلان) جابجا نظر آتا ہے۔

ایک مشہور شعر ہے:

چھیڑتی ہیں کبھی لب کو کبھی رخساروں کو
تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

یہ شعر غوث خواہ مخواہ حیدرآبادی

(1929-2017) کا ہے جن کا تخلص ہی خواہ مخواہ تھا۔انہوں نے خواہ مخواہ کس کس طرح سے برتا ہے۔

آیئے اب اس بات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اگر تم خواہ مخواہ کرتے قناعت
تو خواہش کی ضرورت ہی نہ ہوتی

کسی کی نظر خواہ مخواہ لگ نہ جائے
بڑھاپے میں لگتے ہو تم نوجواں سے

قافیے اور ردیفوں و تخلص کے سوا
خواہ مخواہ آپ کے اشعار میں کیا رکھا ہے

اوپر دیئے گئے تینوں شعروں میں خواہ مخواہ بروزن خامخا (فاعلن) استعمال ہوئے ہیں۔یعنی خواہ مخواہ کا پہلاہ اور دوسراہ دونوں ساکن ہیں اور تقطیع میں گرادیئے گئے ہیں۔

اب ایک شعر اور دیکھئے:

خواہ مخواہ نہ میرا ہی نہ اور کسی کا لگتا ہے
جتنے شوہر بیٹھے ہیں یہ حال سبھی کا لگتا ہے

اس شعر میں خواہ مخواہ کے دونوں ہ متحرک ہیں اور اپنی پوری آواز کے ساتھ استعمال ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں بروزن فعل فعول۔

افسوس کم ہوا مگر حیرت بہت ہوئی
جب خواہ مخواہ عین ضعیفی میں مر گیا

یہاں خواہ مخواہ صاحب نے خواہ مخواہ کو خامخاہ (فا علان) کے وزن پر استعمال کیا ہے۔

چونکہ ان کا تخلص ہی خواہ مخواہ تھا تو انہوں نے شعری ضرورت کے حساب سے خواہ مخواہ کو ہر ممکنہ پیمانے پر استعمال کیا ہے۔یعنی خامخا، خاہ مخاہ اور خامخاہ-

سوال یہ اٹھتا ہے کہ خواہ مخواہ کا فصیح استعمال کیا ہے۔میری اہلِ علم و دانش سے گزارش ہے کہ وہ اس پر مزید روشنی ڈالیں تا کہ یہ ابہام ختم کیا جا سکے۔

تعلیم سے بہتر تربیت

بوٹا انجم/ ملائیشیا

لاہور کی لنک ماڈل ٹاؤن روڈ پر میکڈونلڈز ریسٹورنٹ ایک کارنر پلاٹ پر واقع ہے۔اِس لیے اُس کا ایک دروازہ مین روڈ پر اور دوسرا برابر والی قدرے کشادہ گلی میں کھلتا ہے۔ایک دوپہر میں اہلِ خانہ کے ہمراہ وہاں کھانے کے لیے بیٹھا تھا کہ گلی کی جانب والے دروازے کے سامنے ایک کار آ کر رُکی جس کی پچھلی سیٹ سے ایک دس بارہ برس کی لڑکی اُتری۔اُس کے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کا ڈسپوزیبل گلاس تھا۔وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر سیدھی اُس جگہ پہنچی جہاں برگر اور چپس کے لازمہ کے طور پر کیچپ رکھی تھی۔اُس نے تسلّی سے گلاس کیچپ سے لبالب بھرا اور اطمینان سے کار میں جا بیٹھی اور ہم اور ہمارے آس پاس بیٹھے لوگ دیدہ دلیری سے کی گئی اُس لڑکی کی اِس غیر اخلاقی حرکت پر اِس سوچ میں پڑ گئے کہ یہ چوری کی واردات تھی یا کہ مائیکرو لیول کا ڈاکہ؟

قریباً دس برس قبل پیش آنے والا یہ واقعہ مجھے بعد میں سوشل میڈیا پر وائرل ہونے والی ایک ایسی ویڈیو سے یاد آیا جس میں اسلام آباد کی ایک شاہراہ پر ڈرائیو کرتی ہوئی ایک خاتون سڑک کے برابر میں واقع گرین بیلٹ کے پاس کار روک کر اُترتی ہے۔گرین بیلٹ پر بطورِ خاص لگائے گئے پھولدار پودوں میں سے اڑھائی، تین فٹ قد کے ایک پودے کی شاخوں کو یکجا کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر جھٹکا دیتی ہے جس سے پودا جڑ سے اُکھڑ کر اُس کی گرفت میں آ جاتا ہے۔وہ پہلے اُسے فرنٹ سیٹ پر براجمان اپنے ساتھی کو تھمانے کی کوشش کرتی ہے مگر ناکامی کی صورت میں گاڑی کا پیچھے والا دروازہ کھول کر پودے کو پچھلی سیٹ پر لٹاتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر روانہ ہو جاتی ہے۔

اِن دو واقعات نے ساحر لدھیانوی کی اِس منظوم آفاقی حقیقت پر میرا یقین قدرے متزلزل کر دیا کہ:

مفلسی ۔۔۔۔۔۔حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

مانا کہ غربت وافلاس کا مارا ہوا انسان اخلاق باختگی کی کوئی بھی حد پھلانگ سکتا ہے بلکہ ایک حدیث مبارکہ کا لُبِ لباب یہ ہے کہ غربت انسان کو الحاد کی حد تک بھی لے جا سکتی ہے۔۔۔مگر مندرجہ بالا تو دونوں ہی واقعات میں اخلاق باختگی کے مرتکب افراد غربت وافلاس کے دائرے میں نہیں آتے کیونکہ موٹر کاروں کے مالکان غریب نہیں ہوا کرتے۔پس ثابت یہ ہوا کہ حسِ لطافت کے مِٹ جانے کا تعلق محض غربت وافلاس ہی سے نہیں ہے بلکہ اِس میں کچھ اور عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔یقین نہ آئے تو شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں کھانا کھلنے کا منظر تصور میں لائیے اور دیکھیے کہ کیسے کیسے کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ پلیٹوں اور کھانوں کے ڈونگوں پر بھوکے بھیڑیوں کی مانند لپکتے ہیں۔

یقین مانیے ایسے افسوسناک واقعات زیادہ تر ہمارے ہی معاشرے کا خاصہ ہیں۔مجھے ملائیشیا میں قیام پذیر ہوئے لگ بھگ دس برس ہو رہے ہیں۔اِس مسلم مُلک کے باسیوں کی اکثریت بھی غریب اور سفید پوش لوگوں پر مشتمل ہے مگر میرا مشاہدہ ہے کہ اِن میں صبر و تحمل، بُردباری، برداشت اور اخلاقی اقدار کے عناصر ہم پاکستانیوں کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔کیلا یہاں کا خودرو پودا ہے اِس لیے شہروں کے اندر خالی جگہوں پر اور شاہراہوں کے کناروں پر بکثرت اُگتا ہے۔اور یہ کوئی نمائشی پودا نہیں، اِسے باقاعدہ پھل لگتا ہے۔دیہات کے آس پاس ہماری لیچی کی طرز کا رمبوتان نامی پھل، ناریل، گریپ فروٹ، پپیتا اور آم کے درخت پھلوں سے لدے ہوتے ہیں۔توڑنا تو درکنار کوئی غیر متعلقہ شخص اُن کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔صرف بااختیار لوگ ہی وہ پھل اُتارتے ہیں یا پھر درختوں پر لگے لگے ضائع ہو جاتے ہیں۔اِس معاشرے کے لوگوں کی یہ خاصیت میرا دھیان حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے بارے میں کہے گئے علاّمہ اقبال کے اِس شعر کی جانب لے جاتی ہے:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہماری طرح صدیوں تک گوری قوموں کے زیرِ تسلّط رہنے والی اور ہم سے بھی دس برس بعد آزاد ہونے والی اِس ملائیشین قوم کو یہ اخلاقی اقدار کون سکھا گیا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اخلاقی اقدار کا فقدان تعلیم کی کمی اور جہالت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ممکن ہے کسی حد تک یہ بات درست ہو مگر اب تو وطنِ عزیز پاکستان کے شہروں اور دیہات میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی تعداد گنی نہیں جاتی۔پھر حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر معروف دانشور اور کالم نگار حسن نثار یہ کہنے پر کیوں مجبور ہے کہ"ہمارا مسئلہ اِقتصادیات سے زیادہ اخلاقیات ہے"میرا ذاتی خیال ہے کہ اِس مسئلے کی بُنیادی وجہ تعلیم کی نہیں تربیت کی کمی ہے۔

عامر بن علی ہمہ جہت شخصیت

روبینہ شہادت/لاہور

روبینہ شہادت نے حال ہی میں عامر بن علی کی سفرنامہ نگاری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ کے موضوع پر یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور سے ایم فل کا مقالہ تحریر کر کے سند حاصل کی ہے۔ان کے تحقیقی مقالہ کی انچارج ڈاکٹر عمارہ طارق تھیں۔ان دنوں مصنفہ تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہیں اور پی ایچ ڈی کا ارادہ رکھتی ہیں۔(ادارہ)

عامر بن علی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔انہوں نے یوں تو اردو ادب کے بارے میں کئی اصناف پر اپنے فن کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ مگر ان کی شہرت کی اصل وجہ سفرنامہ نگاری اور شاعری ہے۔عامر بن علی کا انداز تحریر اچھوتا ہونے کے ساتھ ساتھ متاثر کن بھی ہے۔ کیونکہ وہ نامانوس الفاظ کو استعمال نہیں کرتے۔جس سے قاری اعلیٰ سے اعلیٰ تر مقصد کے بیان کو آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔عامر بن علی کی زبان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی سے متعلق کسی بھی واقعے کے بیان کو آسان و رواں طریقے سے پیش کرتے ہیں۔عامر بن علی کے قلم کی روانی و تیزی میں وسیع النظری اور زرک بینی سے عہد قدیم اور تاریخ کے واقعات کو بڑی عمدگی اور خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

عامر بن علی شاعر، کالم نویس، سفرنامہ نگار، مترجم اور سات زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود حد درجہ کے انکسار پسند انسان ہیں۔ دنیاوی چیزوں کا حرص و لالچ نہیں کرتے۔عامر بن علی ایک ہمدرد اور ملنسار انسان ہیں جن سے پہلی بار بات کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیں پہلے سے جانتے ہیں اور ہمارا بہت گہرا رشتہ ہے۔آپ بیرونِ ملک قیامِ پذیر ہونے کے باوجود ایک اچھے پاکستانی کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی بخوبی سرانجام دیتے ہیں جس کی ایک مثال ان کا ایک اہم کارنامہ ''ارژنگ'' ہے۔ عامر بن علی رسالہ ''ارژنگ'' کے مدیر اعلیٰ ہے۔انہوں نے 1999ء میں اپنے دوستوں کے ساتھ اس ادبی پرچہ کا آغاز کیا اور 2000ء میں ارژنگ کا ڈیکلریشن ملا۔بلاشبہ اُس وقت ماہنامہ ''ارژنگ'' قارئین کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔جب سوشل میڈیا کا نام و نشان نہ تھا۔گزشتہ 25 سال سے ماہنامہ ارژنگ لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔جس کے مدیران لبنیٰ صفدر اور شاعر حسن عباسی ہیں۔اس رسالے کے ذریعے عامر بن علی نے کئی نئے شاعر اور شاعرات کو متعارف کروایا ہے اور ارژنگ کے ذریعے پاکستانی شعر و شاعری اور افسانے کو دنیا بھر کے قارئین تک پہنچایا ہے۔عامر بن علی کا قلم کسی ایک صنف تک محدود نہیں ہے۔انہوں نے مختلف اصناف میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔اگر ان کی سفرنامہ نگاری کی بات کی جائے تو سفرنامے کے کینوس پر عامر بن علی کی تصویر اس سیاح کی سی ہے جو مقصد کی دوڑ میں لپٹے بغیر سفری تھیلے کو کندھے پر ڈال کر جہاں گردی کرتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات کو خارجی لمس اور داخلی احساس کے ساتھ قاری تک پہنچتے ہیں۔سفرنامہ نگار کا پہلا سفرنامہ ''آج کا جاپان'' ہے۔ پھر ''جہاں گردی''، ''نگر نگر اک نظر'' اور ''مشرق کی طرف دیکھ'' کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ایک محقق کی نگاہ دیکھتے ہوئے عامر بن علی نے معلومات کا ایسا خزانہ ان کتابوں میں سینچ دیا ہے کہ قاری کتابوں کی سطروں سے صرف لطف اندوز نہیں ہوتا بلکہ ان لفظوں کے دوش پر سوار ہو کر ان ممالک کی سیر کرتا ہوا خود کو محسوس کرتا ہے۔

عامر بن علی کے حیاتی تعارف کے اوراق کو پلٹا جائے تو انہوں نے مختلف ممالک کی سیر کی ہے اور ان تمام ممالک کے منظرنامے وہاں کی تہذیب اور معاشرت کو جانچنے اور پرکھنے کے بعد قاری کے سامنے منفرد انداز اور متنوع موضوعات میں پیش کیا ہے۔ان میں سب سے زیادہ تفصیلی موضوع ''جاپان'' پر ہے جس میں مصنف کی دس سالہ زندگی کے تمام مشاہدات کا عکس واضح دیکھا جا سکتا ہے۔جاپان کے پھول، کھانے، جانور، رسومات، ٹیکنالوجی، معیشت، سیاست، تعلیم کو اتنی باریک بینی اور عمدگی سے پہلو بہ پہلو کھول کر بیان کرتے ہیں کہ قاری خود کو جاپان کی فضا میں سانس لیتا محسوس کرتا ہے۔عامر بن علی جاپانی معاشرے کے بارے میں اپنے مشاہدات، تجربات کو اخباری کالموں کی شکل میں لکھتے رہتے ہیں۔مگر صحافت کا یہی المیہ ہے کہ ایک تحریر زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہتی۔مواد چھپتے ہی پچھلے کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔مگر مصنف کے یہ تحریری نسخے اردو ادب میں بہترین سرمایہ ہونے کے ساتھ ساتھ جاپانیوں کی تہذیب کو تاحیات روشن رکھیں گے۔

عامر بن علی نے اپنی تصانیف میں جاپان کے ساتھ ساتھ تھائی لینڈ، سری لنکا، قطر، ارجنٹائن، پیرو، دوبئی، ویسٹ انڈیز، جنوبی کوریا اور ملائیشیا کا سفر تحریر کرتے ہوئے تمام ممالک کی روداد کو اتنی عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔کہیں کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔عامر بن علی کے سفرنامے متنوع خصوصیات کے حامل ہیں۔ان کے سفرناموں میں ایک دستاویزی فلم کی طرح معلومات بھی موجود ہوتی ہیں۔عامر بن علی اپنے سفرناموں میں جغرافیائی اور تاریخی مقامات اور پتھر کی عمارتوں کے ساتھ ساتھ انسان کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔وہ اپنے سفرناموں میں ظاہری رنگینیوں کو ہی بیان نہیں کرتے بلکہ حقیقت کا رنگ اُبھارنے کے لیے کرداروں کو شامل کرتے ہیں۔یوں وہ مناظر فطرت سے ہی نہیں بلکہ مظاہر انسانی کے اندر رچی ہوئی سچّی کو بھی دیکھتے اور عمدگی، پختگی سے قلمبند کرتے ہیں۔

عامر بن علی جیسی شخصیت کے بارے میں ہی علامہ اقبال فرماتے ہیں:

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

اللہ تعالیٰ عامر بن علی کو علم و ادب کی راہبری اور رہنمائی کے لیے ہمیشہ سلامت رکھیں۔آمین

محبت کا استعارہ اور لبنیٰ صفدر

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

آج سے کوئی پچاس سال پہلے اپنے سکول کے زمانے میں ایک بس میں لکھا یہ شعر پڑھا تھا:

محبت کے دم سے یہ دنیا حسین ہے
محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

یہ شعر دل پر اس طرح اثر انداز ہوا کہ آج تلک محبت کا لفظ جہاں بھی نظر آئے ایک انجانا سا تجسس ابھرتا ہے کہ شاید محبت کی کوئی نئی تعریف سامنے آنے والی ہے۔ اور لاتعداد بار ایسا بھی دیکھا کہ محبت کو نئے رنگ، نئے خیال، نئے انداز، نئی خوشبو، نئے ذائقے، اور نئے نئے زاویوں سے شعراء، ادباء، اور دانشوروں نے اپنی اپنی علمی، جذباتی، نفسیاتی اور کلماتی قوتِ تفہیم اور اندازِ اظہار وسلیقہِ گفتار سے واضح کیا یا کرنے کی کوشش کی۔ اور ہم بھی محبت کے خوبصورت رنگ اور دلآویز روپ جاننے لگے۔ مگر بغیر کسی مبالغے کے یقین دلایا جا سکتا ہے کہ جب خود شعر کہنا شروع کیا تو محبت کی اپنے طور پر تعریف کی کھوج میں پڑ گئے کہ شاید شاعری میں کوئی نیا رنگ، کوئی نیا اور اچھوتا ذائقہ لایا جا سکے جس کے پیچھے محبت کے نئے اور منفرد معانی کارفرما ہوں مگر برسوں کی تلاش بسیار کے باوجود صرف یہی کہنا پڑا کہ:

کسی کا یہ مصرع تو عہد آفریں ہے
"محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے"

مطلب یہ کہ محبت بس محبت ہے۔ جس کے لیے معانی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایک جذبہ ہے جو کہ انسانوں، حیوانوں، چرندوں، پرندوں، درندوں بلکہ اللہ پاک کی ہر مخلوق کے دل میں موجود ہے مگر اس کا اظہار کیسے کرنا ہے، کب کرنا ہے، کہاں کرنا ہے اور کیوں کرنا ہے یہ سب کچھ انفرادی عقل و دانش، فہم وفراست اور سب سے بڑھ کر اس جذبے کی شدت کے ساتھ مربوط ہے۔ یعنی کہ محبت ہر ایک کے لئے اپنا الگ مفہوم اور جدا کینوس رکھتی ہے۔ البتہ ایک چیز جو سب کے لئے مشترک ہے وہ ہے محب اور محبوب کا وجود۔

ایک اہلِ قلم جب اپنی شعری دریافت میں محبت کے مفہوم کو جانتا ہے تو اسے اپنا محبوب سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ یہ محبوب اس کا کوئی بہت ہی پیارا رشتہ، کوئی دل پذیر منظر، کوئی منفرد سوچ، کوئی نظریہ، کوئی فلسفہ بلکہ کچھ بھی ہو سکتا ہے جسے ہم آئیڈیل کا نام دے سکتے ہیں۔ اور لبنیٰ صفدر اپنے اِس آئیڈیل سے اس حد تک مخلص اور اپنے جذبات اور احساسات میں اتنی صادق ہیں کہ صداقتِ جذبات انھیں یہ کہنے پر مجبور کرتی دکھائی دیتی ہے کہ:

کیسے تم بن مرا گزارا ہو
تم محبت کا استعارا ہو

....

آپ کو بھول ہی نہیں پاتی
میرا کوئی علاج ہے، صاحب!

....

اور جانب یہ اب نہیں اُٹھتی
آنکھ کی آبرو ہے صاحب سے

....

محبت کی حد سے گزرنے لگے ہیں
ہمیں عشق شاید ہونے لگا ہے

درج بالا اشعار جہاں قاری کو ایک طرف شاعرہ کی والہانہ محبت اور شدتِ جذبات کا پتہ دیتے ہیں تو دوسری جانب اس کے محبت کے درجات اور رموز و اسرار سے آگہی کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ پھر کسی محبّ کا محبت کے سمندر میں غوطہ زن رہنے کے بعد آنے والی منزل (عشق) کا ادراک رکھنا بھی ایک عمدہ علمی و تفہیمی حوالہ بن کر سامنے آتا ہے۔ لبنیٰ کی شاعری محبت کی تمام تر اقدار، ضوابط اور اصولوں کا احاطہ کرتے ہوئے انسانی جذبات اور احساسات کی اعلیٰ ترجمانی کرتی ہے، اس منجدھار سے ایک اور تجربہ لئے آگے بڑھتی ہے۔

اک یہی خوبی محبت کو بنائے جاوداں
چاہے جتنی ہو پرانی، یہ نئی بھی کم نہیں

لبنیٰ صفدر محض ایک مقبول شاعرہ کے طور پر شعری تخلیقات پر ہی زور نہیں دیتیں بلکہ ان کے ہاں نسوانی زندگی کے مسائل اور معاملات سے متعلق مشاہدات اور تجربات کی ایک متاثر کن ترجمانی بھی ہے اور ان مسائل پر اُٹھنے والی پُر تاثیر آواز بھی۔ وہ خواتین کی نفسیات کی نمائندگی بھی کرتی نظر آتی ہیں اور ان کے دکھوں کا مداوا بھی۔ اس خصوص میں ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

لبنیٰ! اِن سے نجات کیسے ملے
وہ جو دوزخ گھروں کے اندر ہیں

....

کسی اور کا ہے یا لبنیٰ! وہ میرا؟
یہی عمر بھر استخارا کیا ہے

....

ویسے تو اپنے گھر میں رہتی ہوں
پھر بھی انجانے ڈر میں رہتی ہوں

....

تلخ بہت سچائی ہے ناں!
لبنیٰ! وہ ہرجائی ہے ناں!

مگر لبنیٰ ان تمام نسوانی گھریلو زندگی کے مسائل پر ہی بات ختم نہیں کرتیں۔ انھیں ان کا حل بھی بخوبی معلوم ہے۔ وہ اپنی ہم نفسوں کو مجموعی طور پر ایک مثبت اور قابلِ عمل نکتہِ خیال بھی تجویز کرتی ہیں۔ جس پر عمل پیرا ہو کر معاشرتی زندگی خوبصورت اور آسودہ ہو سکتی ہے۔ یہاں لبنیٰ کی معاشرتی اصلاحی فکر اور بالیدگئ خیال کی داد دیے بغیر رہا نہیں جاتا:

آج مجھے بس آخری معرکہ سر کرنا ہے
تیرے گھر والوں کے دل میں گھر کرنا ہے

یہ ایک ایسا تیر بحدف نسخہ ہے کہ جس کے استعمال سے بڑے بڑے معاشرتی اور گھریلو اختلافات اور نسوانی مسائل منٹوں میں حل ہو سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کی نظر نسوانی مسائل کے ساتھ ساتھ عام معاشرتی کج رویوں پر بھی مرکوز رہتی ہے۔ کہیں تو طوفانِ بادو باراں میں غریبوں کی اُڑتی چھتیں

انھیں مغموم کیے دیتی ہیں اور کہیں بولنے والی زبانیں کٹتی نظر آتی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ معاشرے کے مختلف طبقات کی مجبوریوں کو بھی جانتی ہیں اور بے باکی اظہار کے نتائج سے بھی واقف ہیں:

غریبوں کو گھٹا مہنگی پڑی ہے
کہ بارش کی دعا مہنگی پڑی ہے

....

مرا انجام لبنیٰ! جانے کیا ہو؟
کہ کچھ کہنے کی جرات کر رہی ہوں

لبنیٰ صفدر کی شاعری میں جہاں طرح طرح کے مضامین انتہائی متاثر کن انداز میں باندھے گئے ہیں وہیں ان کی صاف گوئی یا یوں کہیے کہ ہمارے معاشرے کی موجودہ اخلاقی بے راہ روی پر نسوانی مجبوریاں اور مشرقی سماجی اقدار کی پاسداری کی باز گشت بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ بہت ہلکے پھلکے انداز میں اتنی بڑی معاشرتی لغزش کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جس پر آج کے حوالے سے پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

خود کو جاکر کہاں چھپاؤں میں
ہر طرف ڈھونڈتی ہوئی آنکھیں!
اس نے کچھ کہہ دیا تھا ایسا، پھر
مجھ سے تو بات بھی نہ ہو پائی

لبنیٰ صفدر اور سماجی شعور:

محترمہ لبنیٰ صفدر کا شاعرانہ کلام جہاں انسانی اور نسوانی زندگی کے ساتھ منسلک بہت سے حوالوں اور مختلف مضامین سے آراستہ ہے وہیں ان کا ایک مضبوط اور مستحکم حوالہ سماجی شعور بھی ہے۔ عام طور پر دیکھا جائے تو شعرا کے ہاں تو سماجی حوالوں سے کافی کچھ مل جاتا ہے جبکہ شاعرات اس طرف کم کم ہی نظر دوڑاتی ہیں مگر لبنیٰ صفدر کے ہاں سماجی شعور کا ایک منفرد نظام کام کر رہا ہے۔ ان کی نظر آدمی اور آدمیت پر بھی جاتی ہے اور تہذیب وتمدن کے ہوتے ہوئے سماجی وحشیانہ پن پر بھی، انھیں خود ساختہ سماجی تفاوت بھی آزردہ خاطر کرتا ہے اور نفرت بھرے رویے بھی ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ انھیں قبائلی عصبیت بھی گراں گزرتی ہے اور بے جا مسابقت کی دوڑ بھی۔ اور یہ سب کچھ ویسے ہی نہیں۔ ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سماج اور سماجی روابط کی عمدگی کسی معاشرے کی پرداخت کے لئے اشد ضروری خیال کر رکھی ہے۔ جو کہ ایک بالیدہ سوچ وفکر رکھنے والے شاعر وادیب کی بنیادی پہچان کے طور پر تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اس خصوص میں ان کے متعدد اشعار ان کے مجموعہ کلام میں موجود ہیں جن میں سے چند ایک بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے:

شہر میں احساسِ تنہائی زیادہ ہے مگر
جس جگہ جائیں وہاں پر آدمی بھی کم نہیں

....

پاس حرمت نہیں ہے لفظوں کی
کیسا وحشی سماج ہے صاحب!

....

سانس بھی ٹھیک سے نہیں آتا
نفرتوں کا رواج ہے صاحب!
یہ باقی لوگ جیسے چل رہے ہیں
زمانے! میں بھی ویسا چل رہی ہوں

....

ہوا ہی تیز غلط فہمیوں کی تھی اتنی
وہ دور ہوتا گیا مجھ سے ہر صدا کے بعد

....

ویسے اپنے الگ قبیلے ہیں
خون کا رنگ لال ہے صاحب!

مضموں آفرینی اور سہل پسندی:

لبنیٰ کے ہاں شدت، جذبات اور ندرتِ خیال کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی کے عمدہ نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ سادہ سی بات کو سادہ الفاظ میں سہل ممتنع کی خوبیوں سے متصف کرتے ہوئے اتنے پُر اثر انداز سے زیبِ قرطاس کئے جاتی ہیں کہ بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہیں ہونے پاتی۔ شاید ان کی سہل پسندی اور سادگیِ الفاظ میں زباں و بیاں کی معجز نمائی کارفرما ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے کہ عام قاری کی سطح پر ابلاغ کی عمدہ سہولت بہم پہنچاتی ہے اور اساتذہ شعر وفن کی نظر میں خوش آئند اسلوبیاتی حسن کے طور پر تسلیم کی جاسکتی ہے۔ انتہائی مختصر الفاظ کا برمحل دروبست اور ان کی معنی آفرینی تخلیق کار کی فنی چابکدستی کی عمدہ مثال بن کر سامنے آتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

سمندر کی ہر لہر رُک سی گئی ہے
وہ پانی میں پاؤں ڈبونے لگا ہے

....

دل کے صفحے پلٹ رہا تھا وہ
میں محبت کے باب سے نکلی

....

تم مری ہار تم ہو جیت مری
تم منافع ہو، تم خسارا ہو

....

شاخ سے پھول بن کے نکلوں گی
اس لئے اک شجر میں رہتی ہوں

....

راستہ اور کوئی ہے ہی نہیں
تم مجھے ہر طرح گوارا ہو

....

اس کا کاندھا ہو، مرا سر لبنیٰ!
شام ہو، چاند ہو، ستارا ہو

....

اپنے پیروں میں جگہ دینی تھی
مجھ کو افلاک پہ رکھ دینا تھا

اور اسی طرح کے بیسیوں اچھوتے مضامین لبنیٰ صفدر کے مجموعہ کلام کی زینت بنے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ اس پورے مجموعہ کلام میں محض اوزان برابر کرنے کی مجبوری سے کوئی بھرتی کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ جو کہ لبنیٰ کی زباں و بیاں پر دسترس اور عروض وبدیع سے پوری پوری واقفیت کا پتہ دیتا ہے۔ پھر چھوٹی اور رواں بحور، چست قوافی اور موثر ردائف اس مجموعہ کلام کو خصوصی فنی خوبیوں سے متصف کرتے ہوئے اس کی ادبی حیثیت کو مستحکم کرتے ہیں۔ جس پر وہ مبارک باد کی مستحق ٹھہرتی ہیں۔

''غزل گو'' کی شاعری......

امجد علی

کائنات ایک لازوال اور لامتناہی خزانہ ہے، جو مکاں سے لامکاں، ممکنات سے ناممکنات اور شعور سے لاشعور کے تمام سفر اور منزلیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جتنے نسل آدم کے گل اور خار ہیں، سب اسی گلشن سے متعلق ہیں اس خزانے کو تلاش کرنے میں لاتعداد انسان اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہیں۔ نت نئی جستجو کے اسی سلسلے میں شاعر اور ادیب بھی سرگرداں ہیں اور یہ تخلیق کار بھی اپنے لطیف و حسین الفاظ و احساسات کے ذریعے اس دنیا کے رنگوں میں اپنی فکر کی خوشبو بھرنے میں مصروف عمل ہیں۔ انہی نامور شاعروں اور ادیبوں میں ایک نام جناب محمد نوید مرزا کا بھی ہے، جن کی ادبی دنیا میں طویل ریاضت، جہد مسلسل اور کئی جہتوں میں تخلیقی کام نے انھیں اپنے دور کے ممتاز اہل قلم میں ایک انفرادیت عطا کی ہے۔ نوید مرزا ایک سرکاری ادارے میں ملازمت، گھریلو ذمہ داریوں اور زندگی کے بہت سے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے باوجود 40 کے قریب کتب تحریر و تالیف کر چکے ہیں، جن میں سے تیس شائع ہو چکی ہیں۔ نوید مرزا کا ادبی کام شاعری، کالم نگاری، بچوں کا ادب، تنقید نگاری، تحقیق اور ناول نگاری تک پھیلا ہوا ہے۔ نوید مرزا کے والد شاعر درویش، مصور احساس بشیر رحمانی مرحوم اپنے دور کے ممتاز شعراء میں رہے ہیں، انھیں کی دعاؤں کے طفیل آج نوید مرزا ادبی دنیا میں صلہ و ستائش کی پرواہ کئے بغیر کامیابی کے سفر پر گامزن ہے۔ نوید مرزا نے اپنے والد کے نام پر بزم بشیر رحمانی کی بنیاد رکھی ہے اور اب وہ بشیر رحمانی فاؤنڈیشن بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔

محمد نوید مرزا کی زیر تبصرہ کتب، غزل گو حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب نوید مرزا کے آٹھ مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ شعری مجموعے سے منتخب کی گئیں سو غزلوں کا انتخاب ہے، جسے جناب عابد حسین اور محترمہ ثمینہ بٹ نے بڑی عرق ریزی سے ترتیب دیا ہے اس کام کے لئے دونوں شعراء لائق تحسین ہیں کہ ان کی محنت کی بدولت نوید مرزا کی ذات اور فنی صلاحیتیں یکجا ہو گئی ہیں۔ اس کتاب میں آپ کو نوید مرزا کی بہترین غزلیں پڑھنے کو ملیں گی۔ نوید مرزا کے پاس موضوعات کی فراوانی ہے۔ کہیں زندگی کے آزار ہیں تو کہیں شعروں میں خوشیاں جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ذات کی کھوج، عرفان ذات، مٹی، شجر، ہجر، پرندوں سے دوستی، دکھی انسانیت کے مسائل، سیاست کے اتار چڑھاؤ اور بہت سے تلخ حقائق کی کھوج میں ہمہ وقت مصروف عمل ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر شاعر کے ذہن کی کثیر الجہات تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری میں کہیں کہیں مشکل استعارات ہیں تو کہیں بلا کی سادگی، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ عرفان اور عرفان ذات بھی ان کی شاعری کا حصہ ہے۔ آیئے کچھ مثالیں دیکھتے ہیں۔۔۔

خاک ہوں، پانی ہوں یا مجھ میں شرر موجود ہے
میں وہاں تک ہوں جہاں تک رہگذر موجود ہے

....

منکشف کر مجھے بتا کیا ہے
میری مٹی کی انتہا کیا ہے

....

ترے جمال کے حیرت کدے میں رہتا ہوں
خبر نہیں کہ یہ رستہ کہاں نکلتا ہے

جو تصور سے ماورا تھا نوید
اس کی تصویر کیا بناتا میں

....

ماورا ہے تو ہر تخیل سے
نور بھی ہے ترے جمال میں گم

....

اے خدا تو ہی تو دکھائی دے
اس جہاں میں ترے سوا کیا ہے

غم دوراں سے کب کوئی بچ پایا ہے، جو بیتی ہو سب اپنے اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ شاعر غموں کو لفظوں کے پیکر میں ڈھالتے ہیں تو غم کے سفیر بن کر ایسے لکھتے ہیں کہ زخم تازہ ہو کر درد بھری ہوک بن جاتے ہیں۔ اپنے غم، دکھ اور درد کو شاعر ایسے بیان کرتے ہیں کہ نم آنکھوں کی کیفیت گیلے کپڑوں کو نچوڑنے وقت جیسی ہو جاتی ہے۔ گھر اور قریبی رشتوں سے الگ ہونا ایک ایسی کرب ناک کیفیت ہے، جسے ایک حساس شاعر ہی بیان کر سکتا ہے، درج ذیل اشعار کو ملاحظہ کر کے لگتا ہے نوید مرزا نے اس کرب کی شدت کو روح کے اندر تک محسوس کیا اور پوری شدت سے اشعار میں رقم کیا ہے۔۔۔

اذیت کیا بتاؤں، جب تعلق گھر سے ٹوٹا تھا
سلامت تھا میں باہر سے مگر اندر سے ٹوٹا تھا

بتا اے قافلہ سالار تو اس دکھ میں شامل ہے
وہ کیسی شام تھی جب میں ترے لشکر سے ٹوٹا تھا

اس رنجیدہ اور کرب والم سے بھری ہوئی صورت حال کو بھی دیکھتے ہوئے وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

میں تلخیوں میں گذار آیا ہوں عمر ساری
نوید لہجے سے خوش کلامی نہیں گئی ہے

مشکل بات کو سہل لفظوں میں بیان کرنا بھی کمال کی بات ہے۔نوید مرزا مشکل موضوعات کو سہل انداز میں شعروں میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنی تخلیقی ہنر مندی اور بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اردو غزل کو نت نئے افکار سے ثروت مند کیا ہے۔یہی تو نخلستان ادب کی پروقار منزل ہے، یہی تو کمال عروج فن ہے، یہی تو ابتدائے بقا ہے جو اپنی ذات کی نفی کے بغیر ممکن نہیں۔سو نوید مرزا اس امتحان میں سرخرو ہو کر آج آسمان ادب پر مہہ کامل کی طرح چمک رہے ہیں۔

ایک ادیب اور شاعر کی ذات اور فنی کمالات دو الگ الگ تصویریں ہیں، جیسے ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں، آپس میں جڑ کر بھی آمنے سامنے نہیں ہوتے۔اس لئے الگ بھی ہوتے ہیں۔سمندر دیکھنے میں خاموش ھے مگر اپنے اندر عمیق گہرائیاں اور کثیر جواہر بھی سمیٹے ہوئے ہے۔یہی احساس نوید مرزا کو مل کر اور اس کے اشعار پڑھ کر ہوتا ہے۔سلیم کوثر نے اس منظر کو اپنے ایک شعر میں بڑے احسن طریقے سے استعمال کیا ھے۔۔

میں خیال ھوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سر آئینہ مرا عکس تھا، پس آئینہ کوئی اور ہے

نوید مرزا بھی سر آئینہ کچھ اور ھے اور پس آئینہ اپنی فکر کی گہرائیوں اور جولانیوں میں گم ھے، یوں اس کا عکس چار سو پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔

نوید مرزا کی ایک اور خوبی یہ بھی ھے کہ وہ ملکی سیاسی و انتظامی حالات کا بھی گہرا اثر لیتے ہیں۔وہ سیاسی تناظر کی بھی خوب عکس بندی کرتے ہیں۔سیاسی تناظر میں ان کے چند شعر دیکھیں۔۔۔

ایک لہجے میں بولتے ہیں سبھی
کون جھوٹا ھے، کون سچا ہے

یہ سیاست نہیں ضرورت ہے
ہم بدل دیں بیان تھوڑا سا

....

چپ چاپ سلگنا بھی غلامی کی طرح ہے
انکار ضروری ھے، تو انکار کریں گے

بڑا ہونے کی دلیل روپیہ پیسہ کوٹھی کار نہیں، حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں،، بڑا وہ ہوتا ہے، جس کے گرد محبت پھیلی ہوا اور وہ محبت کو بہت بانٹ بھی رہا ھو۔۔۔اس حوالے سے بھی دیکھیں تو نوید مرزا کی شخصیت قدآور ہے وہ محبتیں سمیٹنے اور بانٹنے کے ہنر سے خوب آشنا ہیں۔۔۔دو شعر دیکھیں۔

میں آئینہ ہوں مرے روبرو محبت ہے
جہاں پہ میں ہوں وھاں چار سو محبت ہے

یہ اور بات ہے لہجے ہیں مختلف اپنے
تمھاری اور مری گفتگو محبت ھے

نوید مرزا ریاکاری، تکلفات تعیشات کی طرف مائل نہیں، بلکہ مقصدیت، زندگی کے حقائق کی تلخیص، محبت، تحقیق اور جذبات کے حیرت کدوں سے مزین شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔وہ بظاہر سادہ مگر اصل زندگی میں خاصے گہرے ہیں۔وہ ایک نوبل انسان ھیں، جو خود کو بھی پہچانتے ھیں۔وہ کسی ہیرے سے کم نہیں، وہ اپنی قدر و قیمت کو بھی پہچانتے ھیں۔اسی لئے وہ اپنے مقام کو یوں بیان کرتے ہیں۔۔۔

بلندی پر جہاں موجود ہوں میں
سر نوک سناں موجود ہوں میں
اسے قیمت کا اندازہ نہیں ہے
تہہ آب رواں موجود ہوں میں
جہاں ہونا مرا ممکن نہیں تھا
ہمیشہ سے وہاں موجود ہوں میں
بکھرتے جا رھے ھیں نقش سارے
اکیلا ھی یہاں موجود ھوں میں

فرمان حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روشنی میں انسان لمحہ لمحہ اپنی ذات کو تلاش کرنے میں مصروف ھے۔ہمارے شاعر بھی انھی کوششوں میں مصروف ہیں۔نوید مرزا بھی اپنی شاعری میں خود کو ڈھونڈ رھے ھیں، آیئے چند شعر دیکھتے ھیں:

بظاہر میں مکان رنگ و بو میں قید ہوں لیکن
مگر پرواز سوچوں کی فضائے لامکاں تک ہے

....

دور تک کیوں ابد کے سائے ہیں
کیا ازل آج تک نمود میں ہے

....

مرے وجود سے گذرا ہے شور صدیوں کا
مرے وجود کے اندر جہان بولتے ہیں

....

جو عدم سے اٹھا کے لایا گیا
اب مقید وہ ہست و بود میں ہے

....

یہ اذیت بھی کم نہیں ہے نوید
مجھ پہ میرا ہنر نہیں کھلتا

....

سر میدان یہ کیسا کھیل ھے مرگ مسلسل کا
کبھی اپنے کبھی دشمن کے سر واپس نہیں آتے

میں غزل گو کی اشاعت پر مبارک دیتے ہوئے نوید مرزا کی مزید کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں۔آخر میں ان کی دعائیہ حمد باری تعالیٰ سے دو شعر نذر قارئین ہیں:

بھنور میں ڈوب رہا ہوں ابھار دے مولا
سمندروں میں کنارے اتار دے مولا
دعائیں مانگ رہا ہوں سکوت شب میں نوید
ہتھیلیوں پہ ستارے اتار دے مولا

گُھر

وسیم گوہر/مترجم: سلیم شہزاد

''وہ''گُم ہوا تھا یا شاید مر گیا تھا۔کوئی بات یقینی نہیں تھی۔اس کا کوئی اَتا پتا نہیں ملا تھا۔

وہ سب اُسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے تھے۔

مگر وہ.... وہ معلوم نہیں کہاں گُم ہو گیا تھا۔دریا پار کر گیا تھا یا پھر.... یا پھر.... کوئی بات بھی تو یقینی نہیں تھی....

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی.... بستی والوں کو جب بھی کوئی ایسا شخص نظر آیا جوان کے دکھ درد کا ساتھی بنا.... وہ کہیں کھو جاتا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ کس گاؤں کی کہانی ہے ،جس کے دُکھ درد کے ساجھی گُم ہو جاتے ہیں.... یہ کہانی میرے گاؤں کی ہے.... یہ کہانی آپ کے گاؤں کی بھی ہو سکتی ہے.... یہ کہانی ہر اُس گاؤں کی ہے جہاں تم اور میں اور میرے جیسے بے بس منتظر لوگ بستے ہیں.... تو بات ہو رہی تھی گم شدہ بندے کی۔

میں نے اُسے اُسی گھر کی دہلیز پار کرتے دیکھا تھا.... جو بستی کا واحد پختہ مکان تھا....

کوئی بات یقینی نہیں تھی.... مگر میرا دل کہتا تھا کہ وہ اُسی مکان کی دیوار بن گیا ہے.... یا پھر اُس گھر کے پُراسرار لوگوں کے اَن دیکھے ہاتھوں نے اُسے فرش کے ساتھ فرش بنا دیا تھا۔

پورے گاؤں میں شک کا پنچھی اُڑتا پھرتا تھا۔

''تُم نے اُسے آخری بار کہاں دیکھا تھا؟''

''چوہدری کی حویلی میں۔''

''نہیں، وہ کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا تھا۔''

شک کا سانس پُھول گیا۔

''میں نے اسے بستی کے اکیلے مکان کی چوکھٹ عبور کرتے دیکھا تھا۔''

اور شک کا پنچھی طویل اُڑان بھر گیا.... کون سچا تھا کون جھوٹا، کون سی بات سچی تھی کون سی جھوٹی.... مجھے پختہ یقین تھا.... مگر کوئی مکان والی بات سُننے کے لیے تیار نہیں تھا.... پتا نہیں لوگوں کے دِلوں میں اُس گھر کا اتنا زیادہ خوف کیوں گھر کر گیا تھا.... مگر وہ مکان....

وہ مکان بستی کے وسط میں اس طرح بنایا گیا تھا کہ بستی کے چاروں اطراف اور لوگ باگ بہ آسانی دیکھے جا سکیں۔مگر مکان کے اندر کیا تھا، اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔

مجھے اور میرے سنگی ساتھیوں کو کنچے کھیلنے سے ہل جوتنے کی عمر تک کے لمبے سفر میں کبھی پتا نہیں چلا کہ لوگ اُس مکان کی بات کرتے ہوئے زرد کیوں پڑ جاتے ہیں؟

اس لیے کہ کبھی میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے اس گاؤں کے باسیوں نے اجتماع کر کے یہ طے کیا تھا کہ سب جوان مل کر اُس مکان کو جلا کر خاکستر کر دیں.... اور پھر اس سے پہلے اُس مکان کو خاکستر کیا جاتا راتوں رات ایک عذاب دھمک دار بوٹوں کی شکل میں اس گاؤں کے باسیوں پر اُترا اور ہر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی.... ہر گھر کے جوان راتوں رات اُٹھا لیے گئے اور اُن میں سے کچھ کی پھر کوئی خبر نہیں ملی اور جو لوٹے ان کے جسم عذاب کی تفسیر بن چکے تھے۔

وہ دِن اور آج کا دن پھر کسی نے ہمت نہ کی کہ اس بلڈنگ کے بارے میں سوچیں یا بات کریں اور اب پھر بڑے عرصے بعد یہ انہونی ہوئی تھی کہ وہ گُم ہو گیا۔

وہ کھو گیا تھا اور انہونی یہ تھی کہ اس کی تلاش انہیں بھی تھی اور بستی والوں کو بھی.... اور وہ....

''بتاؤ، وہ کدھر گیا تمہارا طرف دار؟''

''دیکھو، ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں....''

''مجھے نہیں معلوم.... مجھے نہیں پتا....''

''خاموش رہو۔۔۔ تم سمجھتی ہو ہمیں پتا نہیں....''

''اگر تمہیں پتا ہے تو پھر میرے پیچھے کیوں پڑے ہو....''

صحن میں ان کا قہقہہ پھیل گیا.... باہر کھڑی عورتوں کے جسم قہقہے میں پروئے گئے اور ان کے چہروں پر پسینہ آ گیا....

وہ جس کا وجود تیز ہواؤں میں اُڑان بھرنے ایسا تھا.... اپنی پوری طاقت سے چیخ پڑتی ہے۔

''چلے جاؤ.... چلے جاؤ.... مجھے کچھ نہیں پتا....''

اور وہ جو اُس سے گم شدہ بندے کا اتا پتا لینے آئے تھے، آنکھوں مٰیں بے بسی بھر کر واپس چل پڑے۔

''اگر وہ اب.... اب بھی نہ مِلا تو ہم دوبارہ پھر آئیں گے اور....''

سب عورتیں ڈر کے شامیانے میں چُھپ گئیں۔ رونے اور چیخنے کی آواز کم ہوتی چلی گئی.... عورتیں اندر پوشیدہ ہو گئیں اور مرد بے بسی کے کڑوے گھونٹ پیتے رہے.... سب چہرے سوالیہ نشان بن گئے.... وہ لوٹ گئے تو بستی کی فضا میں شک نے ڈر کو اتنی مضبوطی سے بھینچا کہ گاؤں کی دیواریں کانپ گئیں۔

رات دیر تک بستی کی عورتوں کے خاوند گھر نہ پہنچے تو وہ دروازوں میں آن کھڑی ہوئیں۔بستی کے سارے مرد چوپال میں سر جوڑ کر بیٹھے تھے....

''ہمیں بھی پتا نہیں، اس کی بیوی بھی نہیں جانتی اور وہ بھی جو اُسے ڈھونڈنے آئے تھے.... تو پھر وہ کہاں گیا؟''

''ہم نے اس کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے.... وہ شاید اُس نسل کا آخری چراغ تھا جس نے اس دھرتی کے بیابان میں ایک نئی بستی بسائی تھی اور ہمیں جینے کا نیا رنگ دیا تھا۔

وہ اس بستی کے دُکھ درد کا ساتھی تھا۔اس نے تاریخ کے اوراق پر ایک بار پھر اپنے لہو سے آزادی اور زندگی کی ایسی کہانی تخلیق کرنے کی کوشش کی تھی جس میں آدمی خود اپنا مختار ہوتا ہے.... مگر وہ جو صدیوں سے انسانی شکل وصورت میں انسانوں جیسے بن کے انسانوں پر حکومت کرتے تھے.... ایسی تاریخ رقم کرنے والوں کے سر قلم کرتے آئے تھے۔آج وہ خود بھی اُسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے تھے۔

بستی کے کم زور لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کرتے.... مگر سوال.... سوالوں کے تو جواب ہی گُم ہو گئے تھے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایسے واقعات بستی والے ہر پانچ سات برس کے بعد دیکھتے تھے کہ جو بستی کے دُکھوں کا ساجھے دار ہوا، وہ اس مکان کی چوکھٹ عبور کر گیا اور پھر کبھی نہ ملا۔

مگر وہ.... وہ ایک نئی بات کر گیا.... کہ سب کچھ دُھند میں تھا اور بستی والوں کو کچھ پتا تھا نہ اس فلک بوس مکان کی دیواریں اس کی کوئی خبر دے رہی تھیں۔

افسانہ

آخری سانس کا پھول

انجینئر ظفر محی الدین

میری آنکھ کھلتی ہے تو میں اپنے چاروں طرف تباہ شدہ عمارتیں دیکھتا ہوں۔ فضا میں ہر طرف بارود کی بو پھیلی ہے۔ جس میں سانس لینا محال ہے۔ میں اُٹھنے کی کوششیں کرتا ہوں تو کھانس کھانس کے میرا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ حدِ نظر تک جلتی عمارتوں کا دھواں پھیلا ہوا ہے۔ میری حالت ملبے کے ڈھیر سے مختلف نہیں ہے۔ میرے جسم پر اتنے زخم آئے کہ میرے لیے اُٹھ کر چلنا محال ہے۔ اس لیے میں زمین پر کیڑے کی طرح رینگنا شروع کر دیتا ہوں۔ میں نجانے کب سے یہاں پڑا ہوں۔ میں کون ہوں؟ اس جگہ کا کیا نام ہے؟ مجھے اس حال تک یہاں کس نے پہنچایا ہے؟ ہر طرف تباہی کیوں ہے؟ اس طرح کے نجانے کتنے سوالات میں خود سے کرتا ہوں مگر مجھے اُس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ مجھے لگتا ہے میری یادداشت گم ہو چکی ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ صرف جو منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے بس وہی یاد ہے۔

دور سے بم دھماکوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ عمارتیں گرتی اور تباہ ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔ آسماں پر دھواں اتنا ہے کہ جنگی طیاروں اور میزائلوں کی آوازیں تو آتی ہیں مگر وہ دکھائی نہیں دیتے۔ کبھی کبھی ان جلتی بجھتی عمارتوں اور ملبے کے ڈھیر میں سے کوئی عورت دیوانہ وار اپنے زخمی یا مردہ بچے کو لے کر گرتی پڑتی بھاگتی نظر آتی ہے۔ اُس نے اُسے سینے سے لگایا ہوتا ہے۔ اُس کی چیخ و پکار دل دہلانے والی ہوتی ہے اُس کو دیکھ کر مجھے اپنی بیوی کی یاد آتی ہے اور اپنے چھ سالہ بیٹے محمد بلال کی۔ پھر کچھ دیر کے بعد سب کچھ ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد فلم کی طرح کچھ منظر میری آنکھوں میں گھومنے لگتے ہیں۔

میں اپنی بیوی آمنہ کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کر رہا ہوں۔ ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ پھولوں کی خوشبو سے فضا معطر ہے۔ مدہوش کرنے والی ہوا ہمیں ایک دوسرے کے مزید قریب لا رہی ہے۔ ہم بانہوں میں بانہیں ڈالے دو رویہ پھولوں سے ڈھکی سڑک پر آہستہ قدمی سے چل رہے ہیں۔ آمنہ ایک پھول توڑ کر اُس کو سونگھتی ہے پھر میں وہ پھول اُس کے جوڑے میں سجا دیتا ہوں۔

آمنہ دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتی ہے۔ لرزتے لبوں سے کچھ مانگتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اُس کی گود بھری ہوئی ہے۔ اُس میں ایک نہایت خوب صورت بچہ معصومیت سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتا ہوں تو اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے۔ ”بلال“

آمنہ کہتی ہے۔ ”یہ نام بہت خوب صورت ہے۔ ہم اپنے بیٹے کا نام محمد بلال رکھیں گے۔“

پھر بلال کھلتے ہوئے پھول کی طرح ہماری زندگی میں آ جاتا ہے۔

میں اُسے بانہوں میں اُٹھا کر کہتا ہوں ”میرا بلال“

اور پھر ہم تینوں کے قہقہے اُس پھولوں بھرے باغ میں گونجنے لگتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بلال بڑا ہونے لگتا ہے۔ وہ تتلیوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ ہم اُس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ہم گھاس پر بھاگتے بھاگتے ایک دوسرے کو پکڑتے بے حال ہو کر لیٹ جاتے ہیں۔ بلال اب چھ سال کا ہو گیا ہے۔ ہم تینوں فضا میں صاف نیلے آسمان کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اچانک ایک جہاز دکھائی دیتا ہے۔ بلال جہاز کو دیکھ کر کہتا ہے۔ میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔ میں اپنے ننھے پائلٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں کہ ایک زوردار دھماکہ ہوتا ہے اور ہر طرف دھواں، بارود اور شور پھیل جاتا ہے۔

میری یادداشت پلٹ آتی ہے۔ میں پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر اپنے بلال اور اپنی آمنہ کو ڈھونڈنے لگتا ہوں۔ آوازیں دیتا ہوں رینگتا ہوں کبھی ایک سمت اور کبھی دوسری سمت جاتا ہوں مگر ہر طرف جان لیوا خاموشی اور تباہی ہے۔ اچانک کچھ لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں آتی ہیں۔ وہ زخمی بچوں اور عورتوں کو لے کر بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ میں انہیں مدد کے لیے پکارتا ہوں۔ مگر میری طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ میرے بلال اور بیوی آمنہ کو لے کر ہسپتال جا رہے ہیں۔ میں انہیں جلدی لے جانے کے لیے آوازیں لگاتا ہوں اور ان کے زندہ بچ جانے کی دعا کرتا ہوں۔ ساتھ ہی اسرائیل مردہ باد اور فلسطین زندہ باد کا نعرہ لگاتا ہوں۔ پھر گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔ میں زمین پر گرتا ہوں۔ آخری سانس لیتا ہوں منہ سے لہو نکلتا ہے اور مٹی کے ساتھ مل کر ایک پھول بن جاتا ہے۔ میں نیم مردہ آنکھوں سے اُس پھول کو دیکھتا رہتا ہوں۔ پھر مجھے دور سے آمنہ اور بلال آتے دکھائی دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ میرے قریب آ جاتے ہیں۔ وہ اُس پھول کو اُٹھا کر میرے سینے پر رکھ دیتے ہیں۔ میں اُن کے نام پکارنا چاہتا ہوں مگر میرے ہونٹوں میں اتنی سکت نہیں ہے۔ آمنہ اپنے ہاتھوں سے میری آنکھیں بند کرنے لگتی ہے۔ میں پوری قوت سے اُس کا نام پکارتا ہوں مگر میرے منہ سے اسرائیل مردہ باد اور فلسطین زندہ باد نکلتا ہے۔ پھر مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔

سُرخ دھبہ

انور ظہیر رہبر/ برلن جرمنی

''امریکہ، ٹیکساس کی خوبصورت سڑک پر آٹو میٹک کار بہت تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھی میگی کار میں لگی ایک بڑی اسکرین پر اپنی پسندیدہ ٹی وی سیریل دیکھ رہی تھی۔ روبوٹک کار میں سب کچھ خود کار نظام کے تحت چل رہا تھا۔ کار کی ونڈ اسکرین پر میگی کبھی کبھار دیکھ لیتی کیونکہ اس کار میں اُسے صرف ایک مسافر کی طرح بیٹھنا تھا اور سفر کو انجوائے کرنا تھا۔ سارا کام کار میں لگے روبوٹ مسٹر فال نے سنبھال رکھا تھا۔ کار کی رفتار کب بڑھانی ہے، کب کم کرنی ہے، سگنل پر یا زیبرا کراسنگ پر رکنا ہے، گاڑی میں لگا روبوٹ اور اُس سے منسلک تمام سینسر اپنا کام بڑی مستعدی سے کر رہے تھے۔ کار تھی بھی بہت آرام دہ اور بہت ہی خوبصورت۔ میگی اپنے اس روبوٹک کار کے سفر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ٹی وی سیریل بہت ہی دلچسپ تھی اور وہ اُس میں منہمک ہو چکی تھی۔ کار کی دوسری اسکرین پر جہاں میگی کی نظر نہیں تھی ایک سُرخ اسپاٹ مستقل جل بجھ رہا تھا شاید کوئی الارم تھا جو کچھ بتا رہا تھا لیکن میگی تو اپنی فلم میں محو تھی اور پھر اچانک سے ایک زبردست قسم کا زوردار دھماکہ ہوا اور کار کسی چیز سے ٹکرائی۔ میگی کو زبردست جھٹکا لگا تب اُسے خیال آیا کہ جلدی سے ایمرجنسی بریک کا بٹن دبائے۔ بٹن کے دبنے کی دیر تھی کہ گاڑی کے پہیے چرچرائے اور گاڑی رُک گئی۔ لیکن اُس وقت تک وہ بوڑھا شخص جس کی سائیکل کو کار نے ٹکر ماری تھی سڑک پر گرا آخری سانسیں لے رہا تھا۔

''اُفف یہ اسٹوپڈ لوگ سڑک درمیان سے کراس کرتے ہیں۔ اگر زیبرا کراسنگ سے کرتے تو گاڑی کا خود کار نظام اُس کو پہچان لیتا۔''

میگی بڑبڑا رہی تھی مگر اتنی زور سے کہ راہگیر جو اس دھماکے کی آواز سُن کر یہاں جمع ہو گئے تھے وہ بھی سُن لیں۔ اس طرح وہ اپنی غلطی کو اُس شخص پر ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میگی نے جلدی سے اپنا فون نکالا اور پولیس کو حادثے کی اطلاع دی۔ کچھ ہی دیر میں پولیس اور ایمبولینس اُس جگہ پہنچ گئے۔ پولیس والے میگی سے مستقل سوال کر رہے تھے اور وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اُسے جلدی تھی کہیں پہنچنے کی۔ اُس نے پولیس والے سے درخواست کی کہ اُس کی ایک زوم میٹنگ ہے وہ اُسے ایک اہم فون کرنے دیں اس کے بعد ہی وہ ان کے سوالات کا جواب دے سکے گی۔

اب میگی مستقل فون کر رہی تھی لیکن اُسے اُس کا مطلوبہ شخص مل نہیں رہا تھا۔ اُس کی بے چینی دیکھ کر ایک خاتون پولیس نے اُس سے دریافت کیا،

'' میڈیم کیا بات ہے آپ بہت پریشان اور گھبرائی ہوئی لگ رہی ہیں؟

اُس پولیس خاتون کا خیال تھا کہ اس جان لیوا حادثے کی وجہ سے وہ پریشان ہوگی لیکن میگی تو کسی اور بات سے پریشان تھی، وہ بولی

'' دراصل مجھے دفتر پہنچنے میں دیر ہو رہی ہے۔ دفتر سے میری ساؤتھ کوریا کے ایک روبوٹ کے انجینئر کے ساتھ زوم میٹنگ ہے اور آج ہماری فرم کے لیے ایک بہت بڑے تجارتی معاہدے کو آخری شکل دینی ہے، لیکن جس شخص سے میٹنگ ہے اُس سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ میں اُسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں کچھ تاخیر سے اُسے جوائن کروں گی۔''

اوہ!

پولیس عورت میگی کی بات پر اُسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔۔

خدا خدا کر کے میگی کی پولیس والوں سے جان چھوٹی تو اُس نے اپنی روبوٹک کار سے باقی سفر طے کیا اور اپنے دفتر پہنچی۔ دفتر پہنچ کر اُس نے اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگائی۔ جلدی سے اپنا کوٹ اُتارا اور کرسی پر ہی پھینکا اور جلدی سے لیپ ٹاپ آن کیا اور پھر زوم میٹنگ کو۔ لیکن دوسری طرف سے مسٹر یونگ زوم پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ میگی پریشان تھی کہ یہ بڑی ڈیل کہیں مس نہ ہو جائے۔ اُس نے جلدی سے ساؤتھ کوریا کی فرم کوشان کو فون لگایا اور مسٹر یونگ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایک کورین لہجے کی آواز میں ایک خاتون نے اُسے بتایا کہ

'' معافی چاہتی ہوں آپ مسٹر یونگ سے بات نہیں کر پائیں گی۔ وہ اس وقت آپ سے بات نہیں کر سکتے۔''

'' ارے میری اُن کے ساتھ ایک اہم میٹنگ ہے دراصل میں حادثے کا شکار ہو گئی تھی اس لیے وقت پر رابطہ نہیں کر سکی۔۔۔''

میگی اُس خاتون کو سمجھانے کوشش کرنے لگی۔

'' اچھا آپ بھی؟ اُس خاتون کے منہ سے بے اختیار نکلا لیکن فوراً ہی وہ اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے بولی'' دیکھیں مجھے جتنا کہا گیا ہے اُتنا ہی بتا رہی ہوں کہ اس وقت وہ آپ سے بات نہیں کر سکتے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس خاتون نے فون بند کر دیا۔۔

عجیب و غریب سی بات ہے میگی پریشان کمرے سے نکلی تا کہ اپنے باس کو صورت حال سے آگاہ کر سکے۔

جنوبی کوریا گوسیونگ نامی علاقے کے جنوبی ضلع میں موجود فرم کوشان میں مسٹر یونگ جب داخل ہوا تو اُس وقت اُس کے سر پر آج کی میٹنگ سوار تھی۔ روبوٹ انجینئر ہونے کے ناطے وہ اس فرم کا سینئر ڈائریکٹر بھی تھا اور اس فرم میں خود کار کام کرنے والے روبوٹ کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا تھا کیونکہ یہ روبوٹ بنانے کے کام میں بھی کر چکا تھا اور اس میں اس نے اپنا بہت نام کمایا تھا۔ آج اُس نے اپنی ڈیوٹی دوسری شفٹ میں کروائی تھی تا کہ رات ۱۲ بجے وہ دفتر

سے ٹیکساس امریکہ زوم پر میگی کے ساتھ میٹنگ کر سکے۔ پندرہ گھنٹے کے فرق کے باعث اُسے اکثر بزنس کے لیے ایسا ہی کرنا پڑتا تھا۔ حسب معمول دفتر پہنچ کر اُس نے اپنی چھوٹی سی فریج کھولی اور اورنج جوس کا ڈبہ نکالا۔ اورنج جوس کے گلاس کو منہ سے لگائے آج کی میٹنگ کی تفصیل دیکھنے لگا۔ اُسے بہت خوشی تھی کہ اُس کے روبوٹ کا ایکسپرٹ کے طور پر آج ٹیکساس سے ایک بڑا معاہدہ ہونا ہے۔ جوس پینے سے اُسے مزید بھوک لگنے لگی۔ اُس نے آن لائین پیزا کا آڈر دیا۔ آدھے گھنٹے میں پیزا اُس کی میز پر تھا۔ ابھی اُس نے پیزے کا ایک ہی ٹکڑا اُٹھایا تھا کہ اُس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجائیں کون ہے۔''

اُس نے آواز لگائی۔

ہانپتا کانپتا ایک شخص اندر دوڑتے ہوئے آیا اور مسٹر یونگ سے مخاطب ہوا۔

''مسٹر یونگ روبوٹ روبروک میں کوئی خرابی ہوگئی ہے وہ ڈبوں کو درست انداز سے اکھٹے نہیں کر رہا جس سے پیکنگ میں خلل پڑ رہا ہے۔''

اندر آنے والے شخص نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

''اوکے اوکے تم چلو میں آتا ہوں۔''

مسٹر یونگ نے اُس شخص سے کہا۔

اس شخص کے جانے کے بعد اُس نے پیزا کا ایک ٹکڑا اُٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ اب وہ ربوٹ روبروک کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ ہال میں بے ترتیبی سے سارے ڈبے بکھرے پڑے ہیں بلکہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اُس نے اس بے ترتیبی کو دیکھا اور پھر روبروک روبوٹ سے مخاطب ہوا۔

''کیوں مسٹر روبروک یہ سب کیا ہے کیا آج ٹھیک سے کام کرنے کا دل نہیں چاہ رہا؟''

روبروک ایک دیو ہیکل روبوٹ تھا۔ جس کے بڑے بڑے بھاری ہاتھ اور بڑے بڑے پاؤں کے۔ سامنے مسٹر یونگ ایک بہت ہی چھوٹا سا کھلونا نما انسان نظر آ رہا تھا۔ لیکن مسٹر یونگ کو اپنے بنائے ان روبوٹر پر بڑا فخر تھا اور وہ ان دیو ہیکل کو جس طرح اپنے قابو میں رکھتا تھا۔ اُس خاص روبوٹ پر اُسے بڑا فخر ہی نہیں بہت ناز تو تھا ہی اور کچھ گھمنڈ بھی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ روبوٹ کے درمیان رہنے والا یہ شخص خود بھی روبوٹ بن چکا تھا۔ اُس کی اپنی سیکریٹری کئی سالوں سے اُس کی مسکراہٹ اور اُس کی قربت کے لیے تڑپ رہی تھی لیکن مسٹر یونگ کو صرف اپنے روبوٹوں میں ہی رہنا پسند تھا اور وہ ان سے ہی محبت بھی کرتا، نفرت بھی کرتا اور نئی نئی اختراع بھی ایجاد کرتا رہتا۔

اُس نے روبروک روبوٹ کو آن کیا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ روبوٹ میں کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔ پیزا کا ٹکڑا بدستور اُس کے ہاتھ میں تھا۔ روبوٹ اپنے بڑے بڑے پاؤں کو اُٹھاتا ہوا ایک دیو کی مانند چند قدم آگے بڑھا اور پھر پلٹا اور ڈبے کو اُٹھا کر ترتیب سے اوپر نیچے لگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اُس کا بھاری ہاتھ بالکل ہی غلط انداز میں حرکت کر رہا تھا اور ڈبوں کی ترتیب نہیں بن پا رہی تھی۔ مسٹر یونگ روبوٹ کے ذرا اور قریب گیا تو اُسے روبوٹ کی قربت کا احساس ہونے لگا ابھی وہ اُس کے ہاتھوں کو دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک روبوٹ نے ڈبے کے بجائے مسٹر یونگ کو دبوچا اور کنویر بلیٹ پر دے مارا۔ کام کرنے والے دوسرے لوگ دوڑے اور ایک شخص نے روبوٹ کا ایمرجنسی بٹن دبا کر اُسے مزید حرکت کرنے سے روکا۔ اور دوسرے شخص نے کنویر بلٹ کو بند کیا۔ مسٹر یونگ کے سر اور سینے پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ انہیں فوری طور پر اسپتال شفٹ کر دیا گیا۔ جب میگی کا فون آیا تھا اور وہ مسٹر یونگ کو تلاش کر رہی تھی تو اُس وقت فرم کی سیکریٹری نے اپنی فرم کے اس حادثے کی خبر کو باہر نہ نکلنے کے باعث صرف میگی سے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ مسٹر یونگ اس وقت بات نہیں کر سکتے ہیں۔

آج جب میگی دفتر آئی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے نام بہت سارے خطوط آئے ہوئے تھے۔ اُس نے خطوں کو کھولنا شروع کیا۔ ایک خط کورٹ کا تھا اُس پر وکیل استغاثہ نے الزام لگایا تھا کہ اُس حادثے کی وجہ وہ تھی۔ وہ زور زور سے بڑبڑانے لگی۔

''ارے حادثہ تو روبوٹ کا رنے کیا ہے میں نے تھوڑی، یہ مجھ پر کیوں الزام لگایا جا رہا ہے۔''

بڑبڑاتے ہوئے اُس نے اخبار اُٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ اخبار کے تیسرے صفحے پر ایک بہت ہی چھوٹی سی خبر نے اُسے چونکا دیا

''مصنوعی ذہانت کے ایک ربوٹ نے جنوبی کوریا میں ایک شخص کو دبوچ لیا۔''

وہ اخبار لے کر اپنے باس کے پاس دوڑی

''مسٹر ابراہام دیکھیں یہ خبر دیکھیں۔ اچھا ہی ہوا کہ ہم نے جنوبی کوریا سے روبوٹ خریدنے کا بڑا معاہدہ نہیں کیا۔''

''اچھا مجھے بھی دکھاؤ کیا خبر ہے۔''

مسٹر ابراہام نے میگی سے اخبار لے کر پڑھنا شروع کیا۔ اور پھر اُس سے مخاطب ہوا۔

''سوری میگی! تمھارا اندازہ غلط ہے۔ ارے فرم میں پہلے بھی حادثات ہوتے رہے ہیں وہ انسانوں سے ہوتے تھے اب روبوٹ سے ہو رہے ہیں۔ حادثے کی وجہ سے کیا فرم بند کر کے کاروبار کرنا چھوڑ دیا جائے۔

تم کوشش کرو یہ روبوٹ ہمیں ہر حال میں ملیں۔ ہم اُن روبوٹوں کو لے کر اُس کی پوری جانچ پڑتال کریں گے اور اُس کی ساری خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے زیادہ بہتر روبوٹ بنا کر جنوبی کوریا کو پیچھے دھکیل دیں گے اور اگر اس کے لیے ایک دو مزدور ہمیں قربان کرنا پڑے تو کیا ہوا۔ ہم دے دیں گے کچھ پیسے اُن کے خاندان کو۔۔۔ پہلے مشین پر خون کا سُرخ دھبہ لگتا تھا اور اب روبوٹ پر۔۔۔''

افسانہ

”کوڈو“

صفدر ناظر/ ملتان

سرما کی دھند میں ریلوے کے آہنی پل کو جو عام گزرگاہ تھی کو عبور کرتے ہوئے پل کے بیچوں بیچ دور سے ایک دھبہ دکھائی دیتا تھا۔ ٹھٹھرتے قدموں سے چلتے چلتے جوں جوں فاصلہ کم ہوتا جاتا، دھبہ بڑا ہوتا جاتا اور قریب پہنچنے پر ایک انسان کی شکل اختیار کر لیا۔ یہ ایک طلبگار خیرات تھا جو پل کے ایک طرف سر نیوڑھائے گڈری میں لپٹا چھپا بیٹھا تھا۔ آگے ایک رومال نما کپڑا دھرا تھا جس پر خیرات کے چند سکے بکھرے پڑے تھے۔ پیسہ، آنہ، دوّنی، اٹھنی اور دو چار دھاتی روپے بھی تھے جن پر چاند تارا کندہ تھا۔ پاکستان بننے کے کوئی پندرہ برس بعد اس روپیہ کی قدر میں کافی تنزلی ہوگئی تھی۔ تاہم جس کے پاس اب بھی اسی سو ہوتے وہ ایک تولہ سونا خرید سکتا تھا اور اگر کسی کی آہنی تجوری میں لاکھ بھر کے قریب ہوتے وہ لکھ پتی کہلاتا تھا اور شہر کے رؤسا میں اُس کا شمار ہوتا تھا۔ اس روپیہ کی اصلی قدر پاکستان بننے تک تھی جب ایک تولہ خالص چاندی سے ڈھلا چمکتا دمکتا سکہ ہوا کرتا تھا جس پر ملکہ وکٹوریہ یا جارج ششم کی تصاویر کندہ ہوتیں اس روپیہ کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کیلئے پاکستان بنایا گیا تھا کیونکہ اس چاندی کے روپیہ کی معتبر تر تعداد پر ہندو بنیا کا قبضہ تھا۔ ساتھ ہی ایک مذہبی نعرہ سیاسی طور پر چپکا دیا گیا تھا۔

روپیہ میں کتنی طاقت ہے کہ وہ پل پر بیٹھے گڈری پوش فقیر کو چھوڑ کر روپیہ کی قدر بے قدری میں کھو گیا۔ بات ہو رہی تھی فقیر کی۔ اس نے بھی گزرتے ہوئے چونی کا سکہ فقیر کے آگے بچھے کپڑہ پر ڈال دیا اور آگے بڑھ گیا اُس نے آئندہ ہر روز فقیر کو ایک چونی دینا شروع کر دی۔ وہ صبح کام پر جانے سے پہلے ایک روپیہ کی ریزگاری میں چار چونیاں لے کر چرمی بٹوہ میں ڈال لیتا۔ ایک روز اُسے خیال آیا کہ وہ ایک بظاہر خوش پوش متوسط طبقہ کا شخص ہے جس کی جیب میں چرمی بٹوہ ہوتا ہے جو بہت کم لوگوں کے پاس ہوتا ہے۔ اُسے اپنی حیثیت کا خیال رکھتے ہوئے کم از کم اٹھنی تو دینا چاہئے چنانچہ اُس نے ثواب دارین حاصل کرے کیلئے فقیر کو روزانہ اٹھنی دینا شروع کر دی۔ اپنے چرمی بٹوہ سے اُسے یاد آیا کہ جب اُس کی زندگی میں فقیر آیا اس کے بارہ برس بعد تک بٹوہ جوتے سب اصلی چمڑے کے ہوتے تھے اور نقلی چمڑہ کا کوئی رواج نہ تھا۔ دیہات میں موچی جو پہلے کمی کہلاتے تھے اور بھٹو کی آمد کے بعد ناپید ہو گئے تھے اصلی چمڑہ سے کنیالی جوتیاں اور کُھسے تیار کر کے اپنے گاؤں کے زمینداروں کو فراہم کرتے تھے جنہیں سال بھر بعد گندم کی فصل آنے پر بطور معاوضہ گندم ملتی تھی۔ جبکہ شہر میں بکنے والے جوتے بھی اصلی چمڑے کے ہوتے تھے۔ نقلی چمڑہ کا کوئی رواج نہ تھا۔ جب وہ مشرقی پاکستان گیا تو اصلی چمڑہ کا بڑھیا جوتا خرید کر ساتھ لے گیا تھا۔ جو پچیس روپیہ میں آیا تھا مشرقی پاکستان کو مستقلاً الوداع کہتے ہوئے ڈھائی تین سال بھارت کی مہمانی کے بعد وہ واپس آیا تو بٹوہ کی قیمت پچیس روپے ہو چکی تھی۔ اسلئے اُسے جوتا کی قیمت پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہیں سے اُس کے وطن کا تنزلی کی جانب سفر شروع ہو چکا تھا۔

دیکھا صاحب روپیہ میں کتنی طاقت ہے کہ وہ غریب فقیر کو چھوڑ کر پھر حساب کتاب کے چکر میں پڑ گیا۔ خیر یہ ثواب دارین بھی بڑی کشش رکھتا ہے۔ انسان ساری عمر آخرت سنوارنے کی کوشش یں لگا رہتا ہے لیکن انسان تو انسان ہے، خطا کا پتلا۔ ایک ثواب کے حصول کے بعد دو چار حماقتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اب اُسے ہر ماہ جب یکم تاریخ کو پگار ملتی تو اُس سے اگلے روز فقیر کو ایک روپیہ خیرات کرتا جبکہ باقی دنوں میں اٹھنی چلتی رہتی۔ جب سے اُس نے روپیہ دینا شروع کیا تھا۔ گڈری کے اندر سے آواز آتی ”صاحب شکریہ“ اُس نے فقیر کا چہرہ نہ دیکھا تھا بس آواز سنی تھی۔ جب فقیر اُس سے یک روپیہ پا کر اُس کا شکریہ ادا کرتا تو اُسے بہت اچھا لگتا۔ انسان فطرتاً خوشامد پسند واقع ہوا ہے۔ فقیر کے منہ سے شکریہ سننے کیلئے فقیر کو تیسرے چوتھے روز روپیہ کا سکہ دینا شروع کر دیا۔ اُسے ایسے محسوس ہوا جیسے فقیر سے اُس کی دوستی ہوگئی ہے۔ آخر موسم بہار کی ایک خوشگوار صبح کو اُس نے فقیر سے اُس کا نام پوچھ لیا کچھ تامل کے بعد گڈری کے اندر سے آواز ابھری۔ ”کوڈو“ بھلا یہ بھی کوئی نام ہے پھر بھی اُسے اچھا لگا اور اُس نے زیر لب دو تین بار دھرایا ”کوڈو“۔ اس نے سوچا نام میں کیا رکھا ہے۔ اصل شے تو کسی کی شخصیت ہوتی ہے لیکن لوگ تو کہتے ہیں نام کا انسان کی شخصیت پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ ویسے نام ایسے بھی تو ہوتے ہیں ملتان خان، جالندھر خان۔ کافی عرصہ بعد جب اُس کے پوتا کی پیدائش ہوئی تو اُس نے نامولود بچے کیلئے نام سوچنا شروع کر دیا۔ کیسے کیسے نام تھے محمد علی جوہر، محمد علی جناح، محمد ع لی بوگرہ، چوہدری محمد علی، محمد علی کلے۔ چنانچہ محمد علی نام کی عظمت سے متاثر ہو کر اُس نے اپنے پوتا کا نام محمد علی رکھ دیا جو اب امریکہ کے ایک مشہور ہسپتال میں ڈاکٹر ہے اور ڈالر کما رہا ہے۔ اُسے امید ہے کسی نہ کسی دن دنیا کے بڑے ڈاکٹروں میں اُس

کے پوتا کا نام آ جائے گا۔ ابھی تو وہ صرف ڈالر کما رہا تھا۔ وہ ڈالر جس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ ملکوں اور حکومتوں کا پلک جھپکنے میں تختہ الٹ دیتا ہے۔

دیکھئے پھر وہی حادثہ ہوا۔ کوڈو فقیر پیچھے رہ گیا اور راستہ میں ڈالر حائل ہو گئے۔ بڑا آدمی کہلانے کیلئے جھوٹی عزت اور شہرت کیلئے، ہوس کی تسکین کیلئے، دولت میں بڑی طاقت ہے۔ ڈھیر بڑھاتے جاؤ ایک سطح پر آ کر آدمی جتنا ہی دراز قد ہو اس کے نیچے دب جائے گا۔ انسان اپنی تو کیا مالک وقوم کی شناخت بھول جاتا ہے۔ کوڈو کو اس سے کوئی مطلب نہ تھا اس کی پونجی تو وہی چند سکے تھے جن کے حصول کیلئے وہ جلتی لو اور برفاب ہوا میں پل کی بلندی پر بیٹھا رہتا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے اُس کے پاس پانی کی بوتل تک نہ دیکھی۔ اُس نے سوچا انسان جس طرح اپنے جسم کو اپنے وجود کو ڈھال لے اُس طرح کا عادی ہو جاتا ہے۔

کچھ دنوں سے اُسے اشتیاق ہو چلا تھا کہ کوڈو کی شکل تو دیکھے اُس کا خیال تھا دھول سے اٹے، جھریوں زدہ چہرہ خشخشی نیم سفید، نیم سیاہ داڑھی اور آنکھیں اقدارِ زمانہ سے اندر دھنس چکی ہوں گی۔ سر کی جکڑی ہوئی لٹوں میں زمانہ بھر کی دھول پڑ چکی ہو گی۔ اُس نے خیرات ڈالنے کے بعد جھک کر پوری قوت مجتمع کر کے کہہ دیا۔ کوڈو چہرہ تو کراؤ اُسے سبکی سی بھی محسوس ہوئی کہ وہ ایک فقیر کا چہرہ کیوں دیکھنا چاہتا ہے۔ کوڈو نے لمحہ بھر توقف کیا پھر اپنے اوپر سے گدڑی نیچے اتار دی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا پرکشش شخص تھا جسے اقدارِ زمانہ نے کوئی زک نہ پہنچائی تھی ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ روزانہ صبح غسل کر کے فجر کی نماز ادا کرتا ہے اور پھر اپنی روزی کے وسیلہ کی جگہ پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔

جیسا ہوتا ہے انسان کے پاؤں میں چکر ہے اسے اپنی روٹی روزی کے وسیلہ کیلئے دوسرے شہر جانا پڑ گیا۔ اُس دوسرے شہر میں فقیر تو بے شمار تھے لیکن اُن میں کوئی کوڈو نہ تھا۔ البتہ اس کے راستہ میں ایک مسجد آتی تھی جس کے باہر چندہ کیلئے سبز رنگ کا مقفل ٹین کا کنستر رکھا ہوا تھا اب اُس نے اپنی آخرت سنوارنے کیلئے حسب استطاعت اس کنستر میں رقم ڈالنی شروع کر دی۔ [illegible] خیرات اور کنستر میں ڈالی گئی رقم میں واضح فرق نظر آنے لگا۔ اُسے جو طمانیت اور خوشی کوڈو کو خیرات دینے میں محسوس ہوتی تھی وہ مولوی کے چندہ کے سبز کنستر میں رقم ڈالنے میں مفقود تھی۔ کوڈو کی خیرات کا ایک دن اختتام ہو جائے گا لیکن سبز کنستر تا قیامت قائم و دائم رہے گا۔

پھر یوں ہوا کہ وہ کوڈو کے شہر واپس آ گیا۔ اب اُسے رہائش گاہ پل کے اُس طرف ملی تھی جدھر سے پُل عبور کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ اُس نے پل عبور کیا نہ کوڈو سے ملاقات ہوئی البتہ دل میں شدید خواہش موجود تھی کہ وہ پل پر جائے اور کوڈو کو خیرات دے اور ساتھ ہی کوڈو کی خیریت دریافت کرے اسی دوران اُسے اپنے ایک دوست سے ملنے اُس کے گاؤں جانا پڑا جو دس پندرہ کوس کے فاصلہ پر واقع تھا۔ عصر کا وقت تھا جب وہ گاؤں پہنچا۔ وہاں پنچایت ہو رہی تھی معززین اور گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ وہ پنچایت کی کارروائی دیکھنے کیلئے رک گیا۔ وہاں پر فریقین کے درمیان زمین کی حد براری کا جھگڑا تھا اور فریقین کی زمین کی حد پر اُگے درختوں کی ملکیت کے دونوں فریق دعویدار تھے۔ اُن میں سے ایک فریق کوڈو تھا۔ جب اُس کی آنکھیں کوڈو کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو اُسے کوڈو کی آنکھوں میں التجا نظر آئی۔ صاحب میرا راز فاش نہ کرنا، کوڈو اُسی گاؤں کا رہائشی تھا اور پانچ ایکڑ زمین اُس کی ملکیت میں تھی۔ پنچایت نے کوڈو کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ وہ اپنے دوست سے ملنے کے بعد شہر واپس لوٹ آیا اور اُسے دوبارہ پل پر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

اب وہ زمانہ آ گیا جب اُسے ایک قوم کی کوتاہیوں اور بیوقوفیوں کا تماشہ دیکھنے مشرقی پاکستان جانا پڑا۔ جہاں تماشہ کا اختتام ہونے پر اُسے تین سال بھارت کی میزبانی میں گزارنے پڑے۔ تین سال بعد وہ وطن لوٹا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُس کے پاؤں کے نیچے سے پل کھسک گیا ہے۔ اُس کے اندر ایک صدمہ کے ساتھ اشتیاق ابھر آیا۔ کوڈو کہاں گیا۔ چار سال کا عرصہ بڑا لمبا عرصہ تھا۔ شاید کوڈو اس جہان میں نہ رہا ہو۔ اُس کا اشتیاق بڑھا تو وہ کوڈو کے گاؤں جا پہنچا۔ گاؤں سے تھوڑا پہلے پختہ لیکن شکستہ سڑک کے کنارے ایک جدید عمارت موجود تھی۔ جب وہ پہلی بار آیا تھا تو یہ عمارت موجود نہ تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر بڑے گیٹ کے اوپر لگے بورڈ کو پڑھا بورڈ پر لکھا تھا۔ کوڈو میموریل ہائی سکول گاؤں پر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ایک سال قبل گاؤں والوں پر کوڈو کا راز فاش ہو گیا۔ راز فاش ہونے پر کوڈو چارپائی سے لگ گیا۔ اس نے نہ شادی کی تھی نہ کوئی اولاد نہ رشتہ دار تھا۔ تنہا آیا تھا تنہا چلا گیا۔ اپنے بعد اس نے وصیت چھوڑی کہ فقیری سے کمائے ہوئے آٹھ لاکھ روپے جو اُس کے کمرہ سے صحن میں مٹی برتنوں میں دفن تھے کو نکال کر اس اس رقم سے اسکول تعمیر کیا جائے۔ وصیت کے مطابق اسکول تعمیر ہوا اور پانچ ایکڑ زمین اسکول کے اخراجات کے کام آ رہی ہے۔

وہ حیران و پریشان تھا کہ اصلی ثواب دارین تو کوڈو کما گیا۔ اُس نے بھی نوکری وو کری سب چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی۔

افسانہ

نیلو نیل

پروفیسر نور کمال شاہ

نیلا رنگ مجھے بہت پسند تھا۔۔۔۔۔۔

اب رنگوں کی کیمیا گری کا ہنر جاننے والے ہی واقف ہوں گے یا رنگوں و برجوں کا آپسی تعلق جوڑنے والے ہی جانتے ہوں گے کہ نیلے رنگ کی پسندیدگی اور استعمال کی کیا افادیت ہو سکتی ہے یا کہ یہ دلکش رنگ شخصیت کے لئے خوش بختی کے کون کون سے سہانے در وا کر سکتا ہے؛ کہ میں اس سلسلے مین قطعی لاعلم ہوں- مجھے بس ویسے ہی یہ رنگ بہت بھاتا ہے اور جہاں نظر آئے دیکھ کر دل اس کے لئے مچلنے لگتا ہے -یہ پسندیدگی کوئی نئی بالکل بھی نہیں؛ میری یہ خواہش اور پسند اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ میں خود- بچپن میں اپنے گاؤں کی مٹی سے بھری کچی گلیوں میں ننگ دھڑنگ یا آدھے لباس میں ملبوس، بنا جوتوں یا چپل کے بھاگتے دوڑتے اور مٹی کے مرغولے اڑاتے اڑاتے جب بھی کہیں یہی نیلا رنگ نظر آجاتا، ہم رک کر اس کا تماشا دیکھنے میں مصروف ضرور ہو جاتے - نیلا ساگر، نیلے قنات، نیلا لباس یا کسی الہڑ دوشیزہ کا ہوا میں سرسراتا نیلا آنچل، سب کچھ بہت ہی بھلا لگتا تھا۔

سوچنے کا موقع ملتا تو خیالات اور تصورات کی پر کیف دنیا میں ڈوب کر میں دیکھتا کہ نیلے رنگ کا نیا بھڑکیلا جوڑا پہن کر، آنکھوں پہ سیاہ چشمہ لگائے کسی فلمی ہیرو کے انداز میں نازنخروں سے موٹر کار سے اتر آتا ہوں اور خوش خرامی کے انداز میں چلتے اپنی گلی میں داخل ہوتا ہوں -لوگوں کی حیرت میں ڈوبی للچائی نظریں برابر میرا تعاقب کر رہی ہوتی ہیں، اور میں سب سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھ جاتا ہوں - گویا میری خوش لباسی کو داد تحسین پیش کیا جا رہا ہو۔۔!!!!!

نیلے رنگ سے میری اولین شناسائی ماں جی " کے نیلے لباس کو دیکھ کر ہوئی -ممتا سے بھرپور اسی نیلی گود میں میں پلا اور بڑھا - یہ جوڑا اگرچہ اب بہت بوسیدہ اور پرانا ہو چکا تھا مگر ماں جی اسے کبھی کبھار ہی لکڑی کے صندوق سے نکال کر پہنتیں اور بھی خاص خاص موقعوں پر -شائد ان کا یہی ایک ڈھنگ کا جوڑا رہ گیا تھا - یہ جوڑا کافی پرانا تھا اور کبھی کے اچھے وقتوں کی یاد دلاتا رہتا تھا، شاید اماں جی کے شادی کے وقتوں کا جوڑا تھا - مزید نئے کپڑے خریدنے اور بنانے کی پھر کبھی استطاعت ہی نصیب نہیں ہوئی - نئے کپڑے آج کل کہاں، اب تو روکھی سوکھی روٹی ہی میسر آجائے تو غنیمت ہے - سو اسی ایک جوڑے کو متاع عزیز بلکہ متاع جاں سمجھ کر سنبھال کر رکھا ہوا تھا- بہر حال اماں جی جب اور جس بھی موقعے پر یہ نیلا جوڑا نکال کر پہنتیں، مجھے بہت ہی بھلا لگتا اور میں اسے دیر تک محویت کے عالم مین دیکھتا رہتا - ابا جی کی پگڑی کا چادر بھی تو نیلا ہی تھا اور پارو کا دوپٹہ بھی۔۔۔۔۔۔۔

نیلا رنگ پارو کو بھی بہت پسند تھا - پارو اپنے ہی گاؤں کے زمیندار کی بیٹی تھی، سندر اور حسین، میرے ساتھ ہی گاؤں کے سکول میں داخل تھی مگر دو تین جماعتیں پڑھنے کے بعد اس کے باپ نے اسے شہر کے مہنگے سکول مین داخل کرا دیا تھا - شہر ہماری بستی سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا، قریب ہی پڑتا تھا اور اس کا فاصلہ گاؤں سے فقط پانچ چھے کلومیٹر ہی بنتا تھا - پارو کو لینے سکول کی گاڑی روزانہ ہماری بستی میں آتی اور چھٹی کے بعد سہ پہر کو دوبارہ اسے واپس گھر پہنچا آتی - پارو مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور اس کی وجہ شاید ہمارے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی بھی تھی - پارو؛ نیلے رنگ کی رسیا، دراز قد، جھیل سی گہری آنکھیں، سرخ وسفید رنگت، ریشم سے ملائم گال، ہوا سے لہراتی ریشمی سیاہ زلفیں اور دلکش سراپا۔۔۔۔

پسند کئے جانے کے لئے یہی کافی اوزار ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

سکول سے نکلنے کے بعد بھی مجھے اسے دیکھنے کے موقعے ملتے رہتے تھے - پارو کا گھر ہمارے مکان سے ذرا سے فاصلے پر تھا - بس درمیان میں چار مکانات چھوڑ کر پانچواں گھر ان کا تھا - حویلی نما اور عالی شان؛ بہت بڑا اور خوبصورت گھر تھا ان کا، بالکل خوابوں کی طرح ۔۔۔۔ پارو کی ماں ایک اچھی اور مہربان عورت تھی، زمیندار کی بیوی ہونے کے ناطے بستی کی اکثر خواتین ان کے گھر جاتی رہتیں- اماں جی کا بھی ان کے ہاں آنا جانا اکثر لگا رہتا - کبھی کسی کام کاج کے سلسلے میں طلبی ہوتی تو کبھی ویسے ہی وہاں کا چکر لگا آتیں - اکثر میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا اور وہاں پارو اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا - پارو کے گھر دودھ بھی ہمارے ہاں سے جاتا تھا اور یہ ذمہ داری ایک طرح سے میرے سپرد کر دی گئی تھی - بڑا ہونے پر بھی میں ان کے ہاں دودھ پہنچانے جاتا رہا، اس دوران پارو بھی بڑی ہو گئی تھیں اور اس کا دلکش رنگ و روپ اور نکھر آیا تھا-

پارو کے لئے میرے دل مین نرم گوشہ پہلے ہی جنم لے چکا تھا اور اب یہ جذبہ چاہت کا رنگ اختیار کر چکا تھا - اس یک طرفہ محبت کا پتہ مین نے پارو کو لگنے نہیں دیا تھا - پارو اب بھی کبھی سامنے آجاتی تو مجھ سے بات ضرور کرتی مگر معاشرتی و معاشی فرق کی خلیج کافی وسیع تھی اور اس وسعت کو پاٹنا میرے دسترس میں نہیں تھا - پھر بھی ایک سپنا تھا، ایک خواہش تھی کہ کسی طرح پارو تک پہنچ پاؤں - ہمارا رسمی تعلق حدود و قیود کی چار دیواری سے نکل کر کبھی آگے نہ بڑھ سکا-

اب میں کافی بڑا ہو چکا تھا - بے چینی اور بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا - پارو ہر وقت دل و دماغ پر چھائی رہتی - میری دلی کیفیت میرے والدین کی عقابی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی اور یہ بات ان کے

لئے واقعی پریشان کن تھی -زمین نے آسماں تک پہنچنے کی کوشش کی تھی ، اتھاہ گہرائیوں اور کھائیوں نے بلندیوں کو چھونے کی خواہش کی تھی -والدہ نے دبے لہجے میں مجھے بار ہا سمجھانا چاہا" باز آ جاؤ لڑکے ؛ قیامت آجائے گی اگر کسی کو پتہ چلا ؛ زمیندار ہمارا جینا حرام کردے گا"-

مگر خود پر قابو میرے اختیار میں ہی نہیں تھا ؛ بس ہردم اسے ہی دیکھنے کی لگن تھی -معاملات کو سنگین دیکھ کر میرے والدین نے آپس میں سر جوڑ لیے اور خاصی غور وخوض کے بعد منطقی نتیجے پر پہنچے -ان کے پاس وقت بالکل بھی نہیں تھا۔!!!!

اگلی صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی مجھے کراچی کی گاڑی میں بٹھایا گیا جہاں میرے کوئی دور پار کے رشتہ دار پہلے سے موجود تھے -میں خاموش تھا ؛ اف تک نہ کی اور کراچی جا پہنچا -چند مہینے کی سختیاں جھیلنے کے بعد مجھے ایک دفتر میں نوکری مل گئی اور مصروفیات کے جھمیلوں میں کھو کر میں وقتی طور پر پارو کو بھول گیا-

کراچی میں مسلسل تین سال گزارنے کے بعد میں چھٹی پر گاؤں چلا آیا -گھر والوں کے لئے قیمتی تحفوں کے ساتھ میں پارو کے لئے بھی نیلے رنگ کے کپڑوں کا دلکش جوڑا لے کر آیا تھا-

ٹرین سے اتر کر میں تانگے میں بیٹھا اپنی بستی کی جانب رواں تھا کہ بستی سے زرا باہر رخصت ہونے والی بارات گاؤں سے نکل رہی تھی -بے شمار گاڑیاں اور براتی شور مچاتے ہمارے سامنے سے گذرنے لگے -تانگے کو سڑک کے ایک سائیڈ پہ روکے کوچوان نے معلومات دیتے ہوئے مجھے بتایا" جلال بابو!اصل میں آج گاؤں میں زمیندار کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی ، یہ ساری گہما گہمی اسی کی ہے۔دیکھو شادی کی بارات جا رہی ہے"-

میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا ؛ افسردہ نظروں سے بارات کی جانب دیکھا ؛ پارو دلہن بن کر نیلے رنگ کی چمکتی کار میں گاؤں سے رخصت ہو رہی تھی ۔۔۔

دھیان کا ساگر/بسمل صابری

یہ سچ ہے کہ اظہار کو
لفظوں کی ضرورت ہے
جب دنیا پریشاں ہو
انگشت بدنداں ہو
حالات سے نالاں ہو
لفظوں کو زباں دے کر
ہونٹوں کو بیاں دے کر
تم شعر سناتے ہو
اُمید بندھاتے ہو
معلوم ہے یہ سب کو
اپنے سے اُلجھنے کا
فن بھی تمہیں آتا ہے
لفظوں کو زُباں دے کر
ہونٹوں کو بیاں دے کر
آئینہ دکھاتے ہو
تم کیسے دِلاور ہو
تاروں کے دمکنے کو
بادل کے گرجنے کو
پانی کے کھنکنے کو
کنکر کے چمکنے کو
لفظوں میں سموتے ہو
کیا شعر پروتے ہو
تم کیسے دلاور ہو
ساجن اسی ماٹی کے ہو
یا سادھو میرے گاؤں کے
تم گاؤں میں رہ کر بھی
کیا نام اُگاتے ہو
اور مان بڑھاتے ہو
پنوں ہو کہ رانجھن ہو
کس سوہنی کے ساجن ہو
سچی کوئی دھڑکن ہو
خوابوں کے جزیروں کی

احمد ندیم رفیع/امریکا

حسن آنچل ہے وہ تو ڈھلکے گا
عشق پردہ ہے سو وہ رکھے گا
خم کاکل نگارِ ہستی کا
جتنا کھولو گے اتنا الجھے گا
ہم حقیقت بیاں کریں نہ کریں
وقت اپنا فسانہ لکھے گا
عشق ریلا ہے خود شناسی کا
جتنا روکو گے اتنا پھیلے گا
کنجِ تنہائی میں ترا چہرہ
کون آئے گا ، کون دیکھے گا
تیرا شہ کار دیکھنے سر راہ
کون ٹھہرا ہے ، کون ٹھہرے گا
آئنے کو اجالتے ہو کیوں
کس کو فرصت ہے، کون سنورے گا
اس رہِ بے نشاں سے میرے بعد
کون گزرا ہے ، کون گزرے گا
حرف و معنی کا دائمی رشتہ
کون سمجھا ہے ، کون سمجھے گا
عمر بھر رفتگاں کی یادوں میں
کون رویا ہے ، کون روئے گا
اس تغیر پذیر دنیا میں
کون بدلا ہے ، کون بدلے گا
شاخِ گُل ہو کہ حلقۂ سر زلف
پھول ہو گا تو پھول مہکے گا
شہرِ یاراں میں زخم پر مرہم
کس نے رکھا ہے ، کون رکھے گا
تارِ مژگاں پہ اشک ہو یا خواب
شامِ ہجراں ہے، سو وہ چمکے گا
کوئی سیراب ہو کہ پیاسا رہے
وہ تو بادل ہے سو وہ برسے گا
موجِ امکاں کا راستہ اب تک
کس نے روکا ہے، کون روکے گا
آئنے میں دراڑ ہو تو پھر
جو بنے گا وہ عکس ٹوٹے گا
ابرِ زلف سیہ ہٹے نہ ہٹے
مہ کامل ہے وہ تو چمکے گا
نگہِ التفات ہو کہ نہ ہو
دل ہے نادان ، دل تو تڑپے گا

بقیہ انٹرویو: حنیف صوفی

س:۔ پنجابی زبان کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟

ج:۔ جب تک اردگرد مادری زبانوں والے لوگ اپنی ماں بولی سے محبت کرتے نظر آئیں گے۔ انشاء اللہ ہم بھی اپنی مادری زبان سے محبت کرتے نظر آئیں گے۔

س:۔ عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج:۔ میری شادی 1968 میں ہوئی اور میں نے 1969 میں ٹرانسپورٹ کمپنی جوائن کی۔ شاعری اور مزدوری ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

س:۔ تمام زندگی آپ نے شعروسخن کی خدمت میں بسر کی ہے۔ اگر نئی زندگی مالک عطا کردے تو شعروسخن کی نذر کردیں گے؟ یا پھر کوئی اور کام کرنا پسند کریں گے؟

ج:۔ میں آج کل معاشرے میں جو دیکھتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔ اس کو کاغذ اور قلم کے سپرد کر دیتا ہوں۔ جنم جنم کی بات کرنا افسانوی اور دیومالائی خیال ہے مگر بفرض محال ایسا ہوجائے تو شاید اگلے جنم میں بھی شعروسخن ہی اوڑھنا بچھونا ہوگا۔

س:۔ آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج:۔ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا نے بہت کام کیا مگر کچھ لوگوں نے سوشل میڈیا پر ادب کو مذاق بنا دیا۔

س:۔ ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج:۔ جب انسان اندر سے جاگتا ہے اور جب کھلی آنکھ سے دیکھتا ہے اس کے اندر کوئی فنکار موجود ہو تو کسی بھی صنف میں کوئی بھی راستہ اختیار کر کے تجربات و مشاہدات سے فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔

س:۔ کیا کھویا کیا پایا؟

ج: رقم کے نقصان کو میں نقصان نہیں سمجھتا لیکن خرچ کرنے سے جو مجھے ملا۔ وہ بزرگ شاعروں، لکھاریوں، ادیبوں سے میرا تعلق اور دوستی قائم ہوئی وہ میرا سرمایہ ہے۔

س: آپ نے بورے والا میں بے شمار عالمی سطح کے مشاعرے کروائے یہ کیسا تجربہ تھا؟

ج: عالمی سطح پر مشاعرے منعقد کروانے ہیں۔ بورے والا کے پڑھے لکھے اور کریم لوگوں کے ساتھ میری دوستی ہوگئی۔ جو انشاء اللہ تعالیٰ زندگی بھر قائم رہے گی۔

س: شعروادب کی ترویج میں مشاعرے کی کیا اہمیت اور کردار ہیں؟

ج: ادب میں مشاعرے کا کردار گزشتہ پانچ دہائیوں سے بہت اہم رہا ہے اور لوگ دوسرے شہروں س بھی مشاعرے سننے کے لئے آتے ہیں۔ اب تو کوئی بھی ایک آدمی موبائل پر بیٹھ کر مشاعرے کو آن لائن کر دیتا ہے۔ جس سے مشاعرے کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔

پنجابی نمونہ کلام:

جنوں دل تو وکھ نہیں کیتا
اوہ وی کیندا اکھ نہیں کیتا
سجن نوں پہچان نہیں سکیا
میں جو دل نوں اکھ نہیں کیتا
میرے کول وی صفراں ہے تن
پر میں 100 نو لکھ نہیں کیتا

کیڑا کیندا اسیں نواکے لنگے
میں اکھاں وچ اکھاں پاکے لنگیا ساں
بھلاں ورگے لوکاں دی اس وستی چوں
جد لنگیاں ساں پتھر کھا کے لنگیا ساں
انگلاں دے وچ انگلاں پا کے سجن دے
دشمن نو تڑ فا تڑ فا کے لنگیاں ساں
میں بازاں دے جنگل وچوں صوفی جی
انگلی اتے چڑی بٹھا کے لنگیاں ساں

مجبوری دی چکی گیڑن جاندا سی
اپنے الھیچھت ادھیڑن جاندا سی
دو ویلے او پت دی پھوڑی توں
چوھدریاں دے کم نبیھون جاندا سی

دین کا میدا ایک سوھل ملوک لڑھڑا پتر شیخر دو پہرں
ننگے پیریں لسی لے کے ٹریا جاوے بک بک رووے
نالے سوچے جے کر رہا ہندا میہوں ملک ہوراں دا کتا
میہوں مٹھی لسی پی کے ٹھنڈی چھاویں سوندا

جیہڑے دن تو بے دردی نال ٹھہ گئیاں
میریاں اکھاں کنے صدمے سہ گئی
ازادی دیاں خبراں ملیاں اس ویلے
جد ماساں دے وچ زنجیرے پہ گئیاں
فر موسم تے پرچے دیو بغاوت دے
فیر اج چڑیاں بازاں دے نال کہہ گئیاں
چارے پاسے چوھدر رچورا چکے دی
ہن تے پگاں کلیاں جو گیاں رہ گئی
اور کسے تے دوش اے کاہدا صوفی جی
ازلوں پٹھیاں لیکھ لکیراں وہ گیاں
شہر دے وچ دستاراں ونڈیاں حاکم نے
جد سر پھریاں تو ناں موڑیوں لے گیاں

لیکھیں دھوپ سی تاں نیں لبھی
سنگنے رکھ دی چھاں نیں لبھی
پیو نے مڑ کے شادی کرلئی
پر پتراں نون ماں نیں لبھی

بقیہ انٹرویو: تفاخر محمود گوندل

ارژنگ: شاعری جذبات واحساسات کے اظہار کا لطیف ذریعہ ہے۔ آپ کے شعری ماخذ کیا ہیں اور آپ کن موضوعات کو زیرِ بحث لاتے ہیں؟

تفاخر محمود گوندل: آپ نے بالکل درست فرمایا کہ شاعری فی الواقع جذبات واحساسات کے اظہار کا موثر ترین اور خوبصورت ذریعہ ہے۔ میرے خیال میں ایک پرخلوص اور راست باز شاعر کو ایک کہنہ مشق، نثر نگار پر تقدم وفوقیت حاصل ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بات ایک ادیب نثر نگار چار صفحات میں بیان کرتا ہے اسی بات کو ایک اچھا شاعر دو مصرعوں میں بیان کر دیتا ہے اور پھر اس میں غنایت و نغمگی بھی ہوتی ہے جس سے طبیعت میں ایک وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ شاعری زندگی کے ہر شعبے کی ترجمان ہے۔ غمِ روزگار ہو یا غمِ جاناں، نشیب و فراز حیات ہوں یا زلفِ یار کے پیچ و خم، تغیشات زمانہ کی مٹھاس ہو لبِ محبوب کی چاشنی، ہجر و فراق کا تذکرہ ہو یا وصال کی لطافت، فقیہِ شہر کے زہد و اتقاء کی بات ہو یا رندانِ بادہ نوش کی مستیاں، سب شاعری کے موضوعات ہیں اور جن سے شاعری کا آمیختہ تیار ہوتا ہے۔ شاعر زندگی کی جس وادی خارزار میں قدم رکھتا ہے اسی کے زیرِ اثر وہ شاعری کرتا ہے۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندیوں کے بارے میں آپ کا زاویۂ نظر کیا ہے؟ کیا چند عناصر ادب کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں؟

تفاخر محمود گوندل: یہ موجودہ دور کے بہت ہی تلخ حقائق ہیں۔ کسی دور میں ادبی گروہ بندیاں عوام الناس کے دلوں میں چھپے ہوئے حقائق کی عکاس ہوا کرتی تھیں۔ ان گروہ بندیوں کے نمائندگان و سربراہان کی علمی قابلیت مسلمہ ہوا کرتی تھی اور وہ تشنگانِ علم کے لیے فیض رساں ثابت ہوا کرتی تھی۔ لوگ شمارے لے لے کر ان کی شہکارانہ تحریریں پڑھا کرتے تھے۔ ردیف، قافیہ بندی، عروض کی موشگافیوں پر بحث ہوا کرتی۔ لوگوں کے مبلغ علم میں اضافہ ہوتا۔ ادبی بحثوں میں ایک دل پذیر لطافت دیکھنے کو ملتی۔ وصل حبیب اور مولوی جیسے رسالے شائع ہوا کرتے جن کی باگ ڈور علامہ تاجور نجیب آبادی جیسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی۔ بس اب تو "ڈھونڈ انہیں چراغ رخِ زیبا لے کر" آج کل ماحول نہیں رہا۔ اپنے زعم میں جو لوگ تعلیم، ادب کے تاجور بنے بیٹھے ہیں ان کا اپنا علمی پایہ روز بہ روز فروتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ سکالرز بھی تلفظ کی غلطیوں کا صریح ارتکاب کر رہے ہیں۔ نہ جانے ان کی یہ کارفرمائیاں کیا رنگ لاتی ہیں؟

ارژنگ: آپ اردو کے نامی گرامی استاد ہیں۔ قیامِ پاکستان سے اب تک قومی زبان کو عدالتی دفتری اور تعلیمی زبان کا درجہ نہ مل سکا، کیوں؟

تفاخر محمود گوندل: یہ بڑا ہی فکر انگیز اور کرب ناک سوال ہے۔ اپنی قومی زبان سے مجرمانہ بے اعتنائی نے ہمیں کس خطرناک مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس ضمن میں ہم قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک فرنگیوں کی غلامی سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔ یہ ایک طرح کا احساسِ کمتری ہے جو ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ قائداعظم نے اردو زبان پر کامل دسترس نہ رکھنے کے باوجود متعدد مرتبہ ارشاد فرمایا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو، اردو اور صرف اردو ہوگی۔ حالاں کہ ان کے لیے انگریزی لکھنا اور بولنا اردو کی نسبت بہت سہل تھا لیکن ان کی نگاہ دور بیں نے صحیح فیصلہ صادر فرمایا۔ اردو زبان کی اہمیت اور بطور قومی زبان اس کی اشاعت و ترویج نہ ہونے کی وجوہات پر روزنامہ جنگ میں کئی مضامین تحریر کر چکا ہوں۔ یہ ایک تلخ اور طویل داستان ہے لیکن مختصر الفاظ میں اس کا لب لباب یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے تربیت یافتہ اور پروردہ افسر شاہی قومی زبان کی اہمیت کی سوچ عوام میں پنپنے دینا ہی نہیں چاہتی کہ اس کے فروغ سے ان کی فوقیت کو گزند پہنچنے کا خطرہ ہے۔ یہ سوچ ایک کج فہمی کے علاوہ کچھ نہیں۔ تمام ترقی یافتہ ممالک (برطانیہ اور امریکہ چھوڑ کر) کے سربراہان غیر ملکی دوروں میں اپنی قومی زبان پر فخر و ناز کرتے ہوئے ترجمان کے ذریعے گفتگو کرتے ہیں۔ ان میں تین ممالک (چین، روس، فرانس) ویٹو پاور بھی رکھتے ہیں۔ انگریزی نہ جاننے کے باوجود وہ ارتقاء کی حدوں کو چھو رہے ہیں لیکن ایک ہم ہیں کہ اس جاہلانہ تصور کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں کہ اردو اگر قومی زبان کی حیثیت سے باقاعدہ مروج ہو گئی تو ہماری ترقی رک جائے گی۔ سو سب سے بڑی رکاوٹ ہماری بیوروکریسی ہے۔ دفتروں میں کسی کام کاج کے سلسلے میں جانا پڑ جائے تو سی ایس ایس سے منتخب آفیسرز خشونت سے سر اٹھا کر دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے۔ یہ سب احساسِ کمتری کی علامات ہیں۔ سابق چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس جواد ایس خواجہ نے جرات رندانہ سے کام لیتے ہوئے بڑا جرات مندانہ فیصلہ دیا لیکن انگریزوں کے غلام افسروں نے اسے درخورِ اعتنا نہیں جانا۔ نتیجہ وہ نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گیا۔ اس کے لیے متفقہ طور پر ایک انقلابی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔

ارژنگ: فکرِ اقبال کے کئی زاویے ہیں ان میں ہر ایک لامحدود غور و فکر کا متقاضی ہے۔ آپ کو اس حوالے سے سب سے زیادہ کون سا حوالہ پسند ہے؟

تفاخر محمود گوندل: یوں تو موضوعات کے اعتبار سے کلامِ اقبال ایک بحرِ بے پیدا کنار ہے جس کے عمق کو ابھی تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ مجھے ذاتی طور پر ''اقبال اور عشقِ رسولؐ'' سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس گوشے کا مطالعہ کرتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال پر ہر وقت حضوری کی کیفیت طاری رہتی تھی اور وہ حضور سید المرسلین کی ذات والا صفات کو سامنے دیکھ کر نذرانہ عجز پیش کر رہے ہوں۔ ایسی لطیف کیفیت کم لوگوں پر طاری ہوتی ہے۔ بالخصوص فارسی کلام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کارکنانِ قضا و قدر نے الفاظ کا سمندر اور آبشار کا بہاؤ اُٹھا کر اقبال کی کلک صدف بار کی نوک پر رکھ دیا ہو۔ اقبال کی اس فکر کو کوئی دل جوہری ہی سمجھ سکتا ہے۔

ارژنگ: آپ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے قائل ہیں؟

تفاخر محمود گوندل: میرے خیال میں ادب برائے زندگی والا تصور ایک بدیہہ حقیقت ہے۔ اس سے انحراف کسی صورت ممکن نہیں ہے اور یہ ایک مفیض نکتہ نظر ہے۔ اسی تصور کے ساتھ جینے پر ہی مقصدیت غالب رہتی ہے۔ ادب برائے زندگی ہی قرینہ ہائے حیات کا رخ متعین کرتا ہے۔ اس تخیل کو ادب سے الگ کر کے دیکھا جائے تو باقی کچھ نہیں بچتا۔ بڑے بڑے دبنگ اور صف اول کے افسانہ نگار و ناول نگار ادب برائے زندگی کے ہی قائل تھے۔ ان میں پریم چند، عبدالحلیم شرر اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ شامل ہیں۔

ارژنگ: آپ کی کوئی ایسی خواہش جواب تک پوری نہ ہو سکی؟

تفاخر محمود گوندل: یہی ہے آرزو میری بنے مدفن مدینے میں۔

لبنیٰ صفدر

کچھ سمجھ لوں، پرکھ تو لوں کہ نہیں
پھر بتاؤں گی تیری ہوں کہ نہیں

تو میری آنکھ میں تو جھانک ذرا
یہ سمندر ہے نیلگوں کہ نہیں

میں نے خود کو گلاب کر لیا ہے
تیرے گلدان میں سجوں کہ نہیں

اک ستارہ سا تیری راتوں میں
صبح نو کی کرن بنوں کہ نہیں

جب بچھڑنے لگو بتا دینا
میں صدائیں بھی تم کو دوں کہ نہیں

میں ترا نام اپنے نام کے ساتھ
مالک جان و دل لکھوں کہ نہیں

ہجر تیرا جو مجھ کو لاحق ہے
اُس کو تاعمر میں سہوں کہ نہیں

ایک پتھر کے ساتھ لبنیٰ میں
شیشۂ دل لیے پھروں کہ نہیں

قندیل بدر

شدید حبس کے موسم میں پہلی برف گری
قفس میں قید پرندوں کو سانس آنے لگی
بدن کی نیلی رگوں پر تمہارے ہونٹ پڑے
تو قطرہ قطرہ مساموں سے روشنی پھوٹی
عجیب رنگ تھا کل رات تیرے پیار کا رنگ
حنا گلاب سے مہکی کلائی اور کھلی
فلک سے خالی ہتھیلی میں سرخ پھول گرا
نفس کی کالی حویلی میں ایک کھڑکی کھلی
تمہارے ساتھ کی خوشبو تو خیر کیا ملتی
تمہاری دید کی خیرات بھی کہیں نہ ملی
سنائی دیتی ہے تم کو گھڑی کی ٹِک ٹِک ٹِک
دکھائی دیتی نہیں تم کو میری کاری گری
سمے کی ڈولتی نبضوں کو تھام لو پھر سے
ٹھہر ٹھہر کے تراشو یہ نظم بھید بھری
ترے شباب کو شوخی کو میری عمر لگے
مگر یہ شام کی آمد مگر جو دھوپ ڈھلی
ہزاروں قیمتی پیکر تھے سب میسر تھے
سہاگ و اطلس و عنبر سے میری لاج بھلی
تمہارے ساتھ کی سرسوں ہو، دھند ہو گہری
خیال و خواب کی وادی میں دور آگ جلی
تری نظر کی تپش سے گلال اور بڑھا
ترے جنوں کی حرارت سے پیاس اور بڑھی
بتا رہی ہے تیری نظم کی تراش خراش
قلم کی جنبشِ لب سے جڑی ہے جادوگری
تمہارے ساتھ کی سرسوں ہو، دھند ہو گہری
خیال و خواب کی وادی میں دور آگ جلی

اس بلا سے نجات ممکن ہے

عامر بن علی/ جاپان

چند دن پہلے فلپائن کے ساحل پر ایک وہیل مچھلی مردہ حالت میں پہنچی۔ ملحقہ شہر میں قائم مقامی میوزیم کے اہلکاروں نے سب سے پہلے اس واقعے کی اطلاع ذرائع ابلاغ کو پہنچائی، اور وہیل مچھلی کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ عجائب گھر کی انتظامیہ نے متعلقہ شعبے کے کو بھی ریسرچ کے لئے فوری طور پر مدعو کیا۔ محققین نے اس مچھلی کے پوسٹ مارٹم کے بعد جو اس کی موت کی وجہ بیان کی وہ کافی پریشان کن ہے۔ مردہ وہیل کے جسم کے اندر سے چالیس کلوگرام پلاسٹک شاپنگ بیگ ملے ہیں جنہیں عرف عام میں شاپر کہا جاتا ہے، یہی شاپر ممکنہ طور پر اس مچھلی کی موت کا سبب بیان کیئے گئے ہیں۔ گرچہ بلحاظ حجم وہیل مچھلی اس کرہ ارض میں پائی جانے والی مخلوقات میں سب سے بڑی ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی ایک من پلاسٹک بیگ کی ان کے معدے میں موجودگی بہت سارے سنجیدہ سوالات کو جنم دیتی ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ پلاسٹک شاپنگ بیگ کسی وہیل مچھلی کی موت کا سبب بنے ہوں۔ ماہرین کے مطابق گزشتہ برس بھی ایک وہیل مچھلی اس وجہ سے ہلاک ہوگئی تھی کہ اس کے جسم کے اندر 80 شاپر چلے گئے تھے۔

سمندر میں بڑھتی ہوئی پلاسٹک کی مقدار بے حد سنجیدہ مسئلہ بن چکی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی زمین پر آباد تمام جانداروں کے لئے جان لیوا معاملہ بنتی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں پلاسٹک بیگ یوں دردِسر بن رہے ہیں کہ یہ صدیوں تک یوں کے توں دھرتی ساگر میں موجود رہتے ہیں، گلنے سڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ نہ ہی مٹی میں ملتے ہیں اور نہ ہی پانی میں حل ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنے کوڑے دان جائزہ لیں تو اس میں موجود اشیاء کی واضح اکثریت چند سالوں میں مٹی یا پانی میں حل ہو جاتی ہے۔ بہت سارا کوڑا کرکٹ تو زمین کی زرخیزی کا سبب بھی بنتا ہے۔ فضلہ وغیرہ کھاد کا کام کرتا ہے۔ آپ یہ جان کر شاید حیران ہوں گے اور ممکن ہے کہ پریشان بھی ہو جائیں، کہ پلاسٹک بیگ کو گلنے سڑنے اور حل ہونے میں ایک ہزار سال تک کا عرصہ لگ سکتا ہے۔

جی ہاں! پلاسٹک بوتل یا شاپر ممکنہ طور پر ایک ہزار سال کے طویل عرصہ تک زمین پر آلودگی کا سبب بن سکتے ہیں۔ پلاسٹک بوتل یا دیگر اشیاء کو گلنے سڑنے لے لئے یوں تو پلاسٹک شاپنگ بیگ سے بھی زیادہ وقت درکار ہے، مگر یہ چھوٹا مسئلہ اس لئے ہے کہ عمومی طور پر پلاسٹک کی دیگر اشیاء بار بار استعمال ہوتی ہیں، بوتلیں ری سائیکل کر لی جاتی ہیں، جبکہ شاپر صرف ایک مرتبہ استعمال ہو کر ہماری زمین میں آلودگی کا حصہ بن جاتے ہیں، وہ بھی ایک انتہائی طویل مدت کے لئے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پلاسٹک بیگ سے عملی طور پر نجات ممکن ہے؟ جی ہاں! بالکل ممکن ہے۔ اس بارے میں آپ کو ایک تازہ مثال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میرا برسوں سے لاطینی امریکہ میں بالعموم اور چلی میں بالخصوص آنا جانا رہتا ہے۔ کئی سال تک وہاں قیام پذیر بھی رہا۔ اس نئے سال کی ابتدا کے ساتھ ہی چلی کی حکومت نے پلاسٹک شاپنگ بیگ پر پابندی عائد کر دی۔ اس بیان کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہم عملی طور پر ان مسائل سے کیسے نمٹیں گے جو شاپر پر پابندی کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس کے بہت عادی ہو گئے ہیں۔ نیز یہ سوال بھی اہم ہے کہ اس پابندی پر عمل درآمد یقینی کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ اس بابت چلی کی حکومت نے پہلا قدم تو یہ اٹھایا کہ تمام بڑے شاپنگ سینٹرز اور سپر سٹورز کو پابند کر دیا کہ وہ پلاسٹک بیگ استعمال نہیں کریں گے، شاپر میں سودا بیچنا ممنوع قرار دے دیا گیا، متبادل کے طور پر کپڑے اور پولیسٹر کے تھیلے قیمتاً فروخت ہونے لگے ہیں۔ گھر کا سودا سلف لانے کے لئے ایک بار خریدا ہوا کپڑے کا تھیلا بار بار استعمال ہوتا رہتا ہے، ظاہر ہے ہر بار خریداری کرتے وقت آپ نیا تھیلا نہیں خریدیں گے، چونکہ بہرحال پیسے ضائع ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے شاپنگ پر نکلتے وقت چلی میں اب لوگ تھیلا ساتھ لے جانے لگے ہیں۔ جیسا کہ شاپر کی منحوس ایجاد سے پہلے ہمیشہ ہوتا تھا۔ میرے خیال میں ماحول کے تحفظ کی یہ بہت ہی تھوڑی قیمت ہے جو ہمیں بخوشی ادا کرنی چاہیے۔

آپ اندازہ لگائیں کہ ہمارے پورے ملک میں ایک دن میں کتنے پلاسٹک بیگ استعمال ہوتے ہیں، اور پھر ہر روز یہ کیسے آلودگی میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمیں پلاسٹک شاپنگ بیگ کی عادت اپنائے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ میری مرحومہ پھوپھی یہ شکوہ کیا کرتی تھیں کہ جب سے یہ ناہنجار شاپر آئے ہیں چیزوں سے برکت ہی اٹھ گئی ہے۔ جیسے شاپر تیز ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں، ویسے ہی ان میں لایا گیا سودا سلف بھی غتربود ہو جاتا ہے، فوراً ہی غائب ہو جاتا ہے، ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔ دارالحکومت سنتیا گو میں شاپنگ مال سے ایک جیکٹ خریدی تو کیشئر نے مجھ سے سوال پوچھا کہ کیا آپ کپڑے کا تھیلا خریدنا پسند کریں گے؟ میں نے سوچا صرف جیکٹ ہی تو ہے ہاتھ میں پکڑ کر پیدل نکلا تو محسوس کیا کہ اکثر لوگ سودا سلف ہاتھ میں پکڑے ہی لے جا رہے تھے، اور وہ سب کچھ پہلے سے ہی پیک شدہ ہوتا ہے۔

جاپان میں شاپر کے استعمال میں کمی کے لئے شاپنگ سنٹرز شاپر کی قیمت الگ سے وصول کرنے لگے ہیں تا کہ لوگ کم سے کم پلاسٹک بیگ میں اپنا سامان لے جانے کی کوشش کریں۔ عہد ساز صحافی منو بھائی اکثر ایک افریقی ضرب المثل دہرایا کرتے تھے، کہ یہ زمین ہم نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں نہیں پائی بلکہ یہ دھرتی آنے والی نسلوں کی ہمارے پاس امانت ہے۔ گزشتہ برس برطانوی حکومت یہ چشم کشا رپورٹ شائع کی ہے کہ آنے والے دس برسوں میں سمندر میں پلاسٹک کی مقدار آج کے مقابلے میں تین گنا مزید بڑھنے کا اندیشہ ہے، اگر اس بارے میں کوئی فوری اور سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا گیا۔

مسقط-دو ہزار روپے سے شروع ہونے والا سفر

قرۃ العین حیدر/ لاہور

شمائم نے مجھ سے غالباً فروری 2024 میں 2 ہزار روپے مانگے، کہا کہ ایک مقابلے میں حصہ لینا ہے، یہ معمول کی بات تھی، میں نے دے دیے، میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ کون سا مقابلہ ہوا اور اس میں کیا بنا سوائے تقریری مقابلوں کے کیونکہ وہ کبھی کبھی میں بچوں کو لکھ کر دیتی ہوں کہ اس سے میرا دانشوری جھاڑنے کا شوق پورا ہو جاتا ہے، اب میری بات ان کے سکول کے ججز کو سمجھ نہیں آتی یا ان بچوں کے پیش کرنے کا طریقہ پھسپھسا ہوتا ہے، بہرحال انہوں نے تقریری مقابلہ کبھی نہ جیتا جس کا الزام یہ ہمیشہ سکول میں پروان چڑھتی ہوئی اقربا پروری (nepotism) کو دیتے ہیں یوں ہم سب کا ایمان مقابلوں سے اٹھ چکا تھا۔

پھر ایک دن شمائم نے سکول سے واپس آ کر اطلاع دی کہ میں کوئی بین الاقوامی مقابلہ وغیرہ جیت گئی ہوں تو آپ کو سکول والوں نے بلایا ہے۔ مقابلے کا اگلا حصہ ملک سے باہر ہے، میں نے کہا" نہ چھیڑو ہمیں، ہم ستائے ہوئے ہیں"

جا شاباش کام کر اپنا، ہمارے پاس نہ وقت ہے نہ وسائل جو جیت لیا وہی ٹھیک، اب آگے پڑھو۔۔۔

اچھے نمبر لو، کہیں داخلہ لو، کماؤ، اور گھر سے جاؤ

بہرحال سکول سے فون آنے پر ہم چلے ہی گئے وہاں انہوں نے نئی نوید سنائی کہ مقابلے کا اگلا حصہ سنگاپور اور لندن میں ہوگا۔۔۔ لندن جانے والے بچوں اور ماں باپ میں سے ایک کو ویزہ سپانسر کیا جائے گا۔

(کہ ہم وطنوں کا ٹریک ریکارڈ دیکھتے ہوئے پوری فیملی کو ویزہ دینے کا مطلب ان کی کتاب میں برطانیہ کی معیشت پر labourunskilled کا بوجھ بڑھانا ہے)۔

برطانیہ جانے کے ذکر سے بات چلی تو یاد آیا ہم نے سول سروس میں برطانوی تاریخ پڑھی تھی، پڑھی تو اس لئے تھی کہ نمبر آ جاتے، نمبر تو ہر گز نہ آئے کہ ہم نے برطانوی تاریخ کا گلا دوسری جنگ عظیم پر ہی گھونٹ دیا تھا، اس کے بعد برطانیہ میں جو بھی ہوتا رہا، ہم نے اس میں چنداں دلچسپی نہ دکھائی۔

برطانوی تاریخ کے پرچے میں کم بخت ماڈرن تاریخ کے مارے ممتحن نے ٹونی بلیئر کے خطوط اور مارگریٹ تھیچر کی پالیسیوں پر سوال پوچھ لئے۔۔۔

ہمارا اعتماد دیکھئے نہ ہم نے ٹونی کے خط پڑھے نہ مارگریٹ کی پالیسی لیکن سوال حل کر آئے وہ بھی اندازے سے، اس اعتماد کا فائدہ یہ ہوا کہ پاس ہو گئے، نقصان یہ ہوا کہ ڈوب مرنے والے نمبروں سے پاس ہوئے۔

ہم مطلوبہ میرٹ تو نہ حاصل کر سکے لیکن برطانیہ سے چپکے چپکے غائبانہ محبت کرنے لگے، پھر قانون کی تعلیم کے دوران برطانوی ارتقائے جمہوریت و قوانین نے ذہن میں ننھے ننھے بلب روشن کیے، ہمیں گھر میں انگریزوں کے غلام جیسے طعنے بھی ملتے رہے جس پر ہم ترخ کر کہتے ہیں کہ بھیا تم دے دیتے دنیا کو law common and constitutional، تمہارے حصے کی عقل کیا کوئی اور لے کر بھاگ گیا تھا؟

اب جو لندن کا ذکر آیا تو یوں لگا جیسے کسی نے دل کے تمام تار چھیڑ دیے، ہم نے سوچا کہ اپنے ملک عزیز کی اشرافیہ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے کم وسائل کا تدارک لمبا ادھار لے کر کیا جائے لیکن دل کی خواہشات پر کوئی سمجھوتا نہ کیا جائے، جیسے طاقت ور بیوروکریسی اپنی مراعات پر نہیں کرتی، سو ویزہ کاغذات جمع کرانے سے قبل ادھار پر کام شروع کر دیا۔۔۔

بہرحال ویزہ لگا تو ٹکٹ خریدنے گئے، سفری ایجنٹ پاسپورٹ دیکھ کر بولا آپ مسقط آتی جاتی رہیں؟ میں نے کہا ہاں جب والدین وہاں تھے اور فرصت بھی تھی، کہنے لگا ٹکٹ میں 30 ہزار تک کا فرق پڑے گا اگر مسقط کا بھی ارادہ کر لیں تو وہاں سے transit بنا دوں لندن کا، مجھے اس کا مشورہ مناسب لگا، سوچا ناسٹیلجیا منایا جائے (کہ بچپن جوانی مسقط گزرا)، انہی دنوں کسی حوالے سے سر عمران علی چوہدری سے رابطہ ہوا جن سے پرانی یاد اللہ تھی، ان کو میں نے اپنے مسقط آنے کے متعلق بتایا تو کہنے لگے اگر آنا ہی ہے تو 14 اگست کو آو۔۔۔

میں نے مسقط میں کچھ بچپن کے دوست، اور کچھ اماں ابا کے دوستوں سے رابطہ کیا، ان کا اشتیاق اور محبت دیکھ کر جانا طے کر لیا۔

اچھی تقدیر کہ حکومت پاکستان سے ادھار بھی وقت پر مل گیا، جیسے خود ان کو آئی ایم ایف کی قسط وقت پر مل جاتی ہے، بہرحال احسان ہے اُن کا ورنہ یہ سفر ممکن نہ تھا۔

لاہور سے مسقط کی پرواز پی آئی اے سے تھی، انجن سے آنے والی آوازوں سے لے کر سیب انٹرنیشنل ایئرپورٹ، مسقط بحفاظت لینڈنگ نے ہمارا ایمان اللہ پر مزید پختہ کر دیا کیونکہ رستے میں بحیرہ

عرب پر سے گزرتے ہوئے ہم نے یہی دعا مانگی تھی کہ پروردگار قسمت اپنی پیدائشی خراب ہے، اب 10 سال بعد مسقط جا رہے ہیں، ٹکٹ مسقط کی کٹائی ہے، میرٹ پر فیصلہ فرما اور ہمیں کہیں اور نہیں صرف مسقط ہی پہنچا۔

ہم بچپن میں مچھلی کا "شکار" کرتے رہے ہیں اسی مخلوق کا شکار ہونے سے ڈر لگتا ہے۔

مسقط کا نیا ائیر پورٹ دیدنی ہے، صاف شفاف، چمکتا دمکتا اور سہولیات سے مزین۔

مسقط میں پہلے دن عزت مآب سفیر پاکستان عمران چوہدری صاحب اور ان کے اہل خانہ سے ملاقات ہوئی اور پھر 14 اگست کو سکول نے بطور المنائی دعوت دی۔ رات کو پاکستان بحریہ کا جہاز "یرموک" جو کہ مسقط کے ساحل پر لنگر انداز تھا وہاں سے بھی دعوت نامہ موصول ہوا یوں ہم نے کھڑے جہاز پر کھڑا ڈنر کیا۔

سفیر پاکستان ٹو عمان عمران چوہدری صاحب کا یہ کمال ہے کہ وہ پاکستانی کمیونٹی کے بہت قریب رہتے ہیں، مافیاز وغیرہ سے ان کی جنگ چلتی رہتی ہے۔ اگر کوئی typical foreign office کا سفارتکار ہوتا جو اپنے ہی عشق میں مبتلا رہتے ہیں تو شاید اس کو خبر بھی نہ ہوتی کہ پاکستان سے کوئی بچہ یہاں آیا ہے جو ایک بین الاقوامی مقابلہ میں گولڈ میڈل لے کر دوسرے بین الاقوامی مقابلے میں جا رہا ہے۔ یا اس کو پتا نہ ہوتا کہ 16 جولائی 2024 کو وادی کبیر امام بارگاہ مسقط میں جو قیامت برپا ہوئی، اس رات کون تھا جو لوگوں کی جانیں بچانے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال رہا تھا؟

سفیر پاکستان عمران علی صاحب کو سب کی خبر تھی اور 14 اگست کو پاکستان سکول مسقط میں ہونے والی تقریب میں کئی لوگوں کو شیلڈ دی، سٹیج پر بلا کر عزت دی، acknowledge کیا، کسی کا علاج معالجہ کا بل ہوا تو اس میں مدد کی۔ کمیونٹی کی نبض پر ان کا ہاتھ ہے، مجھے خوشی تب ہوئی جب میرے بچپن کے فیملی فرینڈ اور دوست شہاب علی جو کہ ہندوستان سے ہیں اور اسی امام بارگاہ کے ساتھ رہتے تھے جہاں دہشت گردی کا یہ دلسوز واقعہ ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ افسوس ناک واقعے میں کچھ پاکستانی موقع پر چل بسے، کچھ کو ہسپتال لے جایا گیا، شہر کے راستے بند تھے، ہر طرف خوف کا عالم تھا اور تمہارا (پاکستان) کا سفیر سب سے پہلے ہسپتال پہنچا، پھر عمان حکومت کی خاموشی کی وجہ سے یہ افواہیں زور پکڑنے لگیں کہ دہشت گرد یقیناً پاکستانی ہوں گے، اس وقت تمہارے (پاکستان) کے سفیر نے تمام پروٹول بالائے طاق رکھ کر اپنا ڈیو بیان جاری کیا جس میں ساری صورت حال کھل کر بتائی کہ اس واقعے میں صرف زخمی اور جان سے جانے والے پاکستانی ہیں، تمام افواہیں اسی دن دم توڑ گئیں اور اگلے دن حکومت عمان نے بھی واقعہ پر پریس ریلیز جاری کی جس میں بتایا کہ ان کے اپنے ملک کے لوگ اس واقعے میں ملوث ہیں اور تحقیقات جاری ہیں، شہاب نے کہا یار یہ لیڈرشپ ہے کہ سفیر پاکستان نے اپنی کمیونٹی کی عزت بچانے کے لئے ایک بولڈ initiative لیا وہ بھی ایسے ملک میں جہاں کی حکومت مختلف وجوہات کی بنا پر بات کرنے سے گریزاں تھی۔۔۔۔

مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ایک ہندوستانی شہری پاکستانی سفیر کے متعلق یہ کہہ رہا ہے۔

مظہر امام

ہم سفر بن کے مرے ساتھ نہ سایا نکلا
رات کیا آئی مرا اپنا نہ اپنا نکلا
ایک ہم پر ہی نہیں اتنے مظالم تیرے
جو بھی تھا شہر میں وہ تیرا ستایا نکلا
اس کی باتوں پہ ذرا غور کیا جب میں نے
وہ مرا دوست نہیں ہے یہ نتیجہ نکلا
ہم مراعات کو توہینِ انا کہتے ہیں
یہ الگ بات نہ بٹوے سے کرایہ نکلا
لوگ پھر جانے کہ رشتہ نہیں ہم میں کوئی
بزم سے جب وہ اکیلا میں اکیلا نکلا
وہ ملاقات نتیجہ کیا برآمد کرتی
کچھ زیادہ ہی ترا سخت رویہ نکلا

عمران ہاشمی

سوچتے ہیں کہ نیا رنگ بھریں
کہنہ افسانے میں کیا رنگ بھریں
ہم سے تو بن نہیں پایا یہ طلسم
آپ کچھ ہوش ربا رنگ بھریں
آپ تو ہم سے الگ راہ پہ ہیں
آپ تو ہم سے جدا رنگ بھریں
یہ ورق پیش گل تازہ ہے
اس میں کچھ کھلتا ہوا رنگ بھریں
شرط یہ ہے نئے امکان میں آپ
سات رنگوں سے سوا رنگ بھریں
خواب میں آ کے وہ تصویر ہوئے
نیند میں مَیں نے کہا رنگ بھریں
شام خاموش ہے اور بام اُداس
آپ آئیں تو ذرا رنگ بھریں

سعودی عرب، اُردن، فلسطین اور اسرائیل کے سفر

عمران محسن/ لاہور

جنوری 2023 کی ایک خوبصورت صبح تھی جب میں نے پاکستان سے سعودی عرب کے لیے روانہ ہونے کی تیاری کی۔ میری نیت تھی کہ اس سفر میں نہ صرف عمرہ کی سعادت حاصل کروں بلکہ تین مقدس ترین حرم "مسجد الحرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ" کی زیارت بھی کروں۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ نیت اس کے فضل و کرم سے پوری ہوئی۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر خانہ کعبہ کا پہلا دیدار ایک ایسا لمحہ تھا جو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں حیرت میں ڈوبا ہوا تھا، اللہ کے اس گھر کے سامنے کھڑا، جہاں ہر سال لاکھوں لوگ آ کر عبادت کرتے ہیں۔ عمرہ کی ادائیگی ایک عظیم سعادت تھی، اور ہر قدم پر میں اپنے دل کو اللہ کے قریب تر محسوس کر رہا تھا۔ طواف کے دوران، میں نے اپنی تمام زندگی کے گناہوں کی معافی مانگی اور دل کی گہرائیوں سے دعا کی کہ یہ سفر میری زندگی کا ایک نیا آغاز ہو۔

مکہ سے رخصت ہو کر میں مدینہ منورہ پہنچا۔ مسجد نبوی اور روضہ رسول ﷺ کی زیارت ہمیشہ میرے خوابوں میں تھی، اور جب میں حقیقت میں وہاں پہنچا تو دل کی دھڑکن اور عقیدت کا عالم الفاظ سے پرے تھا۔ یہاں کئی دن عبادات اور دعاؤں میں گزرے، اور میں نے ہر لمحہ محسوس کیا کہ حضور ﷺ کی قربت میں ہوں۔

مدینہ سے میرا اگلا سفر "ال اولہ" کی طرف تھا۔ ال اولہ ایک قدیم شہر ہے جسے کبھی "الحجر" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہاں قوم ثمود آباد تھی جن کے بارے میں قرآن پاک میں ذکر موجود ہے۔ قوم ثمود نے پہاڑوں میں گھر تراشے اور اللہ کی نافرمانی کی، جس کی پاداش میں ان پر عذاب نازل ہوا۔ میدان صالح وہ مقام ہے جہاں ان کی باقیات آج بھی موجود ہیں، اور یہ جگہ ہمیں انسانوں کے عبرتناک انجام کی یاد دلاتی ہے۔

ال اولہ کے پراسرار میدان اور صالح کے آثار قدیمہ کو دیکھتے ہوئے، میں کبھی پیدل اور کبھی لفٹ لیتے ہوئے ان صحراؤں کی وسعتوں میں کھو گیا۔ یہاں کی خاموشی اور تنہائی نے میرے دل کو ایک نئے انداز سے اللہ کی قربت کا احساس دلایا۔ یونہی صحراؤں کی خاک چھانتے اور الحجاز ریلوے لائین کے ساتھ ساتھ چلتے میں تبوک پہنچ گیا۔ تبوک میں ایک پرانے دوست کے ہاں ٹھہر کر کچھ وقت گزارا، جہاں ہم نے پرانی یادوں کو تازہ کیا اور زندگی کے تجربات پر بات کی۔

تبوک سے میرا سفر اردن کی طرف جاری رہا۔ میں نے پیدل بارڈر کراس کیا اور عمان کی طرف روانہ ہوا۔ دارالحکومت عمان میں بحر مردار کے کنارے کھڑا ہو کر، میں نے غور کیا کہ کس طرح اللہ نے قوموں کو عبرت کے لیے نشانیاں عطا کیں۔ اردن میں رومن دور کے کھنڈرات، سیدل اور وادی موسیٰ کے مناظر بے حد متاثر کن تھے۔ وادی موسیٰ میں واقع پیٹرا، جسے ''گلابی شہر'' کہا جاتا ہے، ایک عجوبہ ہے۔ یہ قدیم شہر پتھروں میں تراشا ہوا ہے اور اسے نبطی قوم نے تعمیر کیا تھا۔ پیٹرا کی دیواریں آج بھی اس دور کی شاندار کاریگری اور طاقت کی گواہی دیتی ہیں۔

عمان سے میں نے اسرائیل کا بارڈر کراس کیا اور القدس پہنچا، جہاں مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ The "Dome of Rock" کا دیدار میرے سفر کا ایک اور اہم مرحلہ تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے حضور ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ میں نے وہاں نوافل ادا کیے اور اللہ سے دعا کی کہ یہ سعادت میری زندگی کو ایک نئی سمت دے۔ ماؤنٹ اولو پر چڑھ کر میں نے پورے شہر القدس کا منظر دیکھا۔ یہ پہاڑی مقام فلسطینی اور یہودی علاقوں کے درمیان واقع ہے اور یہاں سے القدس کی خوبصورتی اور تاریخ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

فلسطینی مسلمانوں سے ملاقات کا تجربہ بہت منفرد تھا۔ ان کے چہروں پر دکھ اور حالات کی سختی عیاں تھی، لیکن اس کے باوجود ان کا ایمان مضبوط تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہر روز مشکلات کا سامنا کرتے ہیں، مگر مسجد اقصیٰ میں عبادت کے لیے آنا کبھی نہیں چھوڑتے۔ ان کی استقامت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

یہودی علاقوں میں بھی میں گیا، جہاں دیوار گریہ اور حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش دیکھ کر میں نے سوچا کہ کس طرح مختلف مذاہب کے لوگ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی مختلف تجربات رکھتے ہیں۔ یہاں مذہب اور تاریخ کی ایسی گہری پرتیں ہیں جو ہر انسان کو غور و فکر پر مجبور کرتی ہیں۔

میری یہ زیارت ایک خواب کی تعبیر تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ان مقدس مقامات کی زیارت کا موقع دیا اور میرے دل کو سکون اور اطمینان بخشا۔

مین ازاے سوشل میڈیا اینیمل

امجد محمود چشتی/ میاں چنوں

ارسطو کے زمانے میں انسان محض سماجی حیوان تھا مگر نظریہ ارتقاء کی بدولت آج وہ ،،سوشل میڈیا اینیمل،، بن چکا ہے۔گویا اینیمل سے سوشل اینیمل اور سوشل اینیمل سے سوشل میڈیا اینیمل کا سفر بخوبی انجام پاچکا ہے۔لحہ موجود میں سوشل میڈیا دلوں کی دھڑکن، آنکھوں کی ٹھنڈک، روح کی غذا اور آدابِ حیات کا جزوِ لاینفک اور رنگ، نسل، زبان اور علاقہ کی تفریق کے بغیر مردوزن اور پیروجواں کیلیے آن لائن مرجع الخلائق ہے۔اب کروڑوں کی تعداد میں مخلوق خدا اس کے اخلاقی، معاشرتی، روحانی اور سیاسی فیض سے فیض یاب ہورہی ہے۔بھلے سوشلیوں کی زیادہ تر صلاحتیں فتویٰ وفتنہ سازی پر صرف ہوتی ہیں مگر لوگ جوق در جوق اس کے حلقہء ارادت میں شامل ہوتے جارہے ہیں۔یہاں صنفِ نازک ، صنف سخت اور صنفِ میانہ کی تمیز جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔یہ فرینڈشپ ، فرینڈ ریکوئسٹس، کمنٹس اور سمعی و بصری کالز کا بحرِ بیکراں ہے جس کے اندر لاکھوں غواص غوطہ زن ہیں۔مخلوقِ خدا کا سوشل میڈیا میں استغراق دیکھ کر لگتا ہے جیسے کائنات کے اہم ترین مسائل پہ غور کیا جارہا ہے۔فی زمانہ وائی فائی کی عدم دستیابی اور نیٹ کے نحیف سگنل سانحاتِ عظیم سے کم نہیں جبکہ سوشل میڈیا کا بوجوہ بند ہوجانا قدرتی آفت کا درجہ رکھتا ہے۔آج سوشل میڈیا اینیمل کسی کے ہاں مہمان جائے تو سلام دعا کی جگہ،، یارکوڈ دیں،، سننے کوملتا ہے۔وائی فائی کے سگنلوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہو چلے ہیں۔ پبلک مقامات، کلاس رومز، کھانے کا میز، سرکاری دفاتر، واش روم، کچن، بسترِ استراحت، دورانِ سفرحتیٰ کہ حالت اعتکاف میں بھی لوگ ،،فنافی الفیس بُک،، ہوتے ہیں۔روزو شب سٹیٹس لگانے، کمنٹس ،لائیک اورلَو کے شمار میں بیت رہے ہیں۔مرغی انڈا دے یا بکری بچہ جنے، فیس بک پہ پوسٹ لازم ہے۔ولیموں، جنازوں، چائے نوشی، باراتوں، مزارات، گھر اور مسجد سے نکلتے اور داخل ہوتے وقت کی تصاویر وائرل کرنا ہر فیس بکیئے پہ فرضِ عین ہے۔اب ،،نیکی کر دریا میں ڈال،، کی جگہ،، کچھ بھی کر fb میں ڈال کی کہاوت مناسب ہو گی۔فیس بک، خواتین کے لئے تو نعمت ہے کہ انہیں دوسروں کی ٹوہ میں لگے رہنے کی مشقت کی ضرورت نہیں رہی بلکہ گھر بیٹھے یہ فریضہ انجام دے سکتی ہیں۔آج اگر زیادہ افراد پر مشتمل فیملی کے گھر خاموشی ہوتو وہاں نیٹ کے سگنل فُل ہونے کی دلیل ہے۔حج وعمرہ کی تشہیر اور سیلفی فیس بک کا نورانی پہلو ہے۔بعید نہیں کہ فقہ سوشلیہ میں سیلفی مناسک عمرہ و حج میں شمار ہونے لگے۔

سماجی رابطوں کے حیوان اس جہاں میں صورتِ خورشید ہیں جو اُدھر ڈوب کر اِدھر اور اِدھر ڈوب کر اُدھر نکلنے میں ملکہ رکھتے ہیں۔حسرت ہے ان سماجی حیوانوں پر جو سوشل میڈیا اینیمل بننے سے صدیوں قبل ملکِ عدم سدھار گئے۔رانجھا، مجنوں، ماہیوال اور مرزا اگر سوشل میڈیائی اینیمل ہوتے تو انہیں آبلہ پائی، صحرا نشینی اور معاشرتی مخاصمت و رقابت سے دو چار نہ ہونا پڑتا۔مرزا کو یقیناً کوئی دوست وٹس ایپ پر صاحباں کے بھائیوں کی آمد کی خبر ضرور دے دیتا۔عشاق کو پیام بروں اور کبوتروں کی حاجت بھی نہ رہتی اور رانجھا ہیر کے ساتھ ساتھ، سسی، صاحباں اور سوہنی کا فرینڈ بھی نکلتا۔رانجھے کی بانسری، ہیر کی چوری، سوھنی کے گھڑے ، فرہاد کے تیشے اور لیلیٰ کی کتیا کی پوسٹوں کو ہزاروں لائک ملا کرتے۔شہزادہ سلیم، انارکلی ، محمد شاہ رنگیلا اور یحییٰ خان کی،، یوٹیوبز ،، کے تو لاکھوں فالوورز ہوتے۔سوشل اینیمل سے سوشل میڈیا اینیمل کا سفر ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی تصدیق کرتا ہے جو انٹرنیٹ کے موجب ممکن ہوسکا۔انٹرنیٹ لاکھوں کمپیوٹروں کا تانا بانا ہے جو فون لائنوں، مصنوعی سیاروں اور کیبلز کے ذریعے اک دوجے میں پیوستہ ہے۔انسان جب سماجی حیوان تھا تو یوں شعر کہتا تھا:

ہم جیسے دلبروں کو جہنم میں ڈال کر
بیٹھے رہو بہشت کو ویراں کیے ہوئے

لیکن جونہی ارتقائی عمل سے وہ سوشل میڈیا اینیمل ہوا تو شعری توجیہات ایسے بدلیں:

ہم دلبروں کو کر کے بلاک اپنی وال سے
بیٹھے ہو فیس بک کو ویراں کیے ہوئے

آڈیو اور ویڈیو کریسی کے ظہور سے قبل ماضی کے کتنے مناظر ہونگے جو منظر عام پہ آنے کی سعادت سے محروم رہے۔ستر کی دہائی میں آغا جانیوں اور ان کی رانیوں کی حشر سامانیوں کا سمعی و بصری مواد تو سنبھالے نہ سنبھلتا۔ازمنہ قدیمہ اور قرونِ وسطیٰ کے

کروڑوں بصری مناظر بن دیکھے ہی سپردِ خلا ہو گئے۔ اقوامِ عاد وثمود اور نوح ولوط کیمروں کی آنکھ سے کتنی محفوظ رہیں اور دنیا ان کے کارناموں کے بصری تجسس سے نا آشنا رہی۔ پھر ہم نینڈرتھل اور ہومو سیپئن کو جدید انسان بنتے دیکھ سکتے۔ زلیخا کے الزامات کی قلعی بھی کھل جاتی۔ اموی، عباسی اور عثمانی خلفاء کے پردے بھی چاک ہو جاتے۔ ہم دیکھ پاتے کہ محمود وایاز اور مادھولال کے اونٹ کس کروٹ بیٹھتے تھے؟۔ رام، راون اور یاجوج ماجوج کے کچے چٹھے بھی کھلتے۔ ابدالی، محمد بن قاسم، عالمگیر اور سکندر کی ہیرو شپ جبکہ راجہ داہر، پورس، مرہٹوں اور سکھوں کی ولن شپ کا ریکارڈ بھی مل جاتا۔ کاش محمد شاہ رنگیلا کے دور میں 36 تصویروں والا کیمرہ ہی میسر ہوتا تو کیا تماشہ لگتا۔ پھر ویڈیو کریسی کی صورت میں مغلوں، خلجیوں، غوریوں، لودھیوں ، انار کلیوں، سلیموں، نورجہانوں، شاہ جہانوں اور زیب النساؤں کے معاملات بھی طشت از بام ہوتے ؟۔ قائداعظم کی زیارت ریذیڈینسی کے آس پاس کچھ سی سی ٹی وی ضرور لگے ہوتے۔ مصطفیٰ زیدی اور شہناز گل والے کمرے میں بھی ایک آدھ کیمرہ ہوتا۔ کثرتِ بادہ خواری کے باعث غالب ہمیشہ مغلوب رہتا اور ولی بننے کا دعویٰ نہ کر پاتا۔ ابراہیم ذوق کی فیس بک پہ غالب کی حالت کیا ہوتی؟ کیا الزامات، کیا دشنام اور کیا الم غلم رہتا۔ سائنس کی بے پناہ بلکہ خدا پناہ ترقی سے ہر فرد کے ہاتھ جامِ جمشید لگ چکا ہے۔ جس میں دنیا و ما فیہا کی جملہ حرکات من وعن قابلِ سماعت و بصارت ہیں۔ سوشل میڈیا کی بدولت اب غریبوں کو بھی وہ سب فری میں دیکھنے کو مل رہا ہے جن کے لیے ماضی میں بادشاہوں کے خزانے خالی اور سلطنتیں لُٹ جاتی تھیں۔ اب خلوتوں کے آداب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہے ہیں۔ جہاں ''اللہ دیکھ رہا ہے وہاں کیمرا بھی شریک ہے۔ گویا شہر کا شہر اللہ دین کا چراغ لئے لوگوں کے عیوب ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اب اطلاقی دل پھینک اور بوالہوسوں کی مٹی پلید ہونے کے وسیع اہتمام موجود ہیں۔ دفاتر، گھر، ریستوران، نیٹ کیفے، مدارس، دربار، شادی، غمی، ہسپتال، سکول اور نہ جانے کہاں کہاں کیمروں کی آنکھیں جھانک رہی ہیں اور ان میں لگے کان انہماک سے سب کچھ سن رہے ہیں۔ جب سے انسان سوشل میڈیا اینیمل بنا ہے تو روحانی بابوں نے ہوا میں اڑنا، بندوں کو کھڑے کھڑے جلانا اور قبروں میں نکیرین سے الجھنا چھوڑ دیا ہے۔ اولادِ آدم کو سماجی رابطوں کا حیوانِ ناطق اور گھاتک بنانے میں اللہ کے جن پہنچے ہوئے ذہین بندوں کا ہاتھ ہے ان میں خالق فیس بک عزت مآب زکر برگ، شہنشاہِ انسٹا گرام کیون سسٹروم ومائک کریگر، بابائے مائیکروسافٹ جناب بل گیٹس، مالکِ پے پال جناب ایلون مسک، والیٔ ایمازون باباجی جیف بیزوس حفظ اللہ، بانیانِ وٹس ایپ محترم جان کوم اور ڈیوڈ ایکٹن مدظلہم، امامِ ٹک ٹاک ژانگ یمنگ، آقائے نیٹ فلکس ریڈ ہاسٹنگ، شاہِ گوگل لیری پیج، امیرِ یوٹیوب گروسٹیفن چان اور خواجگانِ ،، یاہو،، جیری یانگ اور ڈیوڈ فیلو جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔ جن کا فیض رہتی دنیا تک جاری وساری رہے گا ۔۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں لاکھوں فیس بکیے، وٹس ایپیے، یوٹیوبیے، ٹوئٹریے، انسٹا گرامیے اور ایمازونیے ہمہ وقت حاضر وناظر ہوتے ہیں۔ یاد رہے سوشل میڈیا کے نوے فیصد پلیٹ فارمز کا ظہور ونزول سرزمین امریکہ میں ہوا ہے ۔ جن مقامات پر بڑے بڑے مہاشوں، دانشوروں، سائنسدانوں، عالموں، انجینئروں، ڈاکٹروں سیاست دانوں، سپہ سالاروں، تاجروں، آجروں اور ڈاکو لٹیروں کے پَر جل کر راکھ ہو جاتے ہیں، سوشلیے ان مقامات کے بھی آشنا نکل آتے ہیں۔ سوشل میڈیا کے جال net کے اندر ہر قسم کے،، میر،، دوسروں پر،، غالب،، آنے کے،، ذوق،، کی ''آتش'' کا ''سودا'' لیے ہیں۔ کچھ ''مومن'' ولی، بننے کی،، حسرت،، کے ''داغ'' لیے پھرتے ہیں۔ کچھ ،، فیض،، حاصل کر کے اپنا،، اقبال،، بلند کرتے ہیں جبکہ بہت سے،، مجروح،، اپنی قسمت پر،، شاکر،، بھی ہیں۔ ہر گھر میں ونڈو کھلی ہے جس میں سے ہر چیز آ اور جا سکتی ہے ۔ اک دور تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے ملتے، دیکھتے بھالتے اور دوستیاں قائم کرتے تھے۔ پھر قلمی دوستی کا دور چلا اور اب ہزاروں آن لائن اور آف شور فرینڈز کا جمِ غفیر براجمان ہے۔ (A I) حضرت انسان کی متبادل بن کر منصۂ شہود پر آئی ہے۔ یہ سوشل میڈیا کے علوم وفنون کی معراج، گنجینۂ معلومات اور خزینۂ ہدایات ہے۔ لاریب کہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل بننے کے قریب ہے اور فرشتے انگشت بدنداں ہیں کہ جنت سے نکالا گیا انسان پھر سے جنت میں گھسنے کے چکر میں ہے۔

سندھ کی لوک کہانیاں

مرزا کاظم رضا بیگ

وادیٔ سندھ، قصوں اور کہانیوں کی سرزمین ہے۔ یہاں کی لوک کہانیاں اتنی ہی پرانی ہیں، جتنی کہ سندھ کی تہذیب وثقافت۔ سندھی لوک کہانیوں میں عوام کے احساسات و جذبات کی وہ جھلکیاں نمایاں ہیں جس کے لیے وہ برصغیر میں مشہور ہیں۔ لوک کہانیاں دھرتی کے سینے سے پیدا ہوتی ہیں، جنہیں لوگ اپنے دلوں کی دھڑکنوں میں دبائے نگری نگری پھرتے ہیں۔ سندھ کی لوک کہانیوں کی تعریف کے لیے اگر صرف یہ کہا جائے کہ یہ جذبات کے بے ساختہ پن تصنع سے دور احساس کی آنچ پر نکھری ہوئی سیدھے سادے لوگوں کی سیدھے سادے انداز بیان میں ایک ایسی دستاویز ہے جو دلوں میں ترازو بن جاتی ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ سندھ کی لوک کہانیوں میں زیادہ تر ایک ایسا پیام ہے جو انسان کو سیدھے راستے پر چلنے اور برائی سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ کہانیاں زندگی کی تلخ وشیریں حقیقتوں کا ایک ایسا نمونہ ہیں، جو ماحول کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اس میں بیانی واقعہ بھی ہے اور داستان دل بھی۔ یہ رنگ محلوں کی داستان بھی ہے اور اس میں جھونپڑوں کے شاہکار بھی۔ یہ کہانیاں دریاؤں سے بھی نکلتی ہیں اور کوچہ و بازار سے بھی۔ ان کہانیوں میں کھیت اور کھلیان کی بھی خبر ملتی ہے اور دریا اور سمندروں کی بھی۔ ان لوک کہانیوں میں جنسی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے اور تصوف کا بھی۔ غرضیکہ یہ لوک کہانیاں فطرت کی دین اور ساز و آہنگ کا ایک ایسا عطیہ ہیں جسے آج بھی لوگ اپنے دلوں میں دبائے گھوم رہے ہیں، جو سینہ بہ سینہ ماضی سے حال تک پہنچ آیا ہے اور حال سے مستقبل کی طرف گامزن ہے۔

سندھ کی لوک کتھاؤں، لوک کہانیوں اور لوک گیتوں میں انسانیت کی یہ اعلیٰ و ارفع اقدار اس طرح گندھی ہوئی نظر آتی ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دیکھا جائے تو یہ اقدار ہمیشہ سے سندھ کے ضمیر و خمیر کا جزو لاینفک رہی ہیں۔ سندھ جب انگریزوں کے ہاتھوں مغلوب ہوا تو سندھی سپاہی بے جگری سے لڑے اور شکست کے بعد بھی وہ انگریزوں کے اطاعت گزار نہ بن سکے۔ حیدر آباد کے ایک بہادر سپاہی ہوش محمد شیدی نے پاس ناموسِ وطن کی خاطر انگریزوں کے خلاف اعلانیہ بغاوت کی۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ جب سندھ کے اس جری سپوت کا لہو اس کے وطن کی دھرتی میں پیوست ہو رہا اور شعلہ حیات بھڑک کر بجھانا چاہتا تھا، اس وقت بھی وہ چڑھتے سورج کے پجاریوں کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ جب اس کا جسم حرارت سے تہی ایک سرد لاشے میں تبدیل ہو گیا تو اس وقت بھی انگریز محاصرین اس کے قریب جاتے ڈر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس کی روح ان پر حملہ آور ہو جائے گی۔

تاریخ کے ہر دور میں سندھ کا کردار اپنی جگہ اٹل اور مستحکم رہا ہے۔ اس کردار، اس مزاج و افتاد کا خمیر اسی دھرتی سے تیار ہوا۔ جس کے کناروں کو بحیرۂ عرب کی شوریدہ موجیں ہر لمحے چومتی ہیں۔ جس کے لق و دق صحراؤں میں بیکراں وسعتیں گم ہو جاتی ہیں۔ جس کے نرم رو دریاؤں کے کناروں پر تہذیبوں کی نوک پلک سنوری ہے۔

سندھ کا لوک ادب سندھ کے مزاج کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ سندھی لوک ادب کا انمول خزانہ وہ لوک کہانیاں ہیں جو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ صرف ان کہانیوں اور داستانوں ہی کے مطالعہ سے ہم سندھ کی معاشرت و معیشت اور اس کے باسیوں کی ذہنی ارتقا کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کہانیوں میں زندگی اپنی لامتناہی وسعتوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ روزمرہ زندگی کے جھگڑے قضیے، محبت کی آنچ، وصل کی سرشاریاں، فراق کی تاب و تب، اونچ نیچ کے بندھن، عاشق کی شجاعت، صداقت، راست روی اور خودداری و محبوب کی وفا شعاری، پاک باطنی اور سپردگی، یہ جلیل و جمیل عناصر سندھی لوک کہانیوں میں تانے بانے کا کام کرتے ہیں۔

سندھی لوک کہانیوں کا بڑا وصف محبوب کے کردار کی عظمت ہے۔ اس میں چنچلپنا اور معشوقانہ ناز و غمزہ و چتر نہیں وہ سیدھی سچی الہڑ اور نیک دل ہے۔ چھوٹے نخرے اور ایمان شکن ادائیں اُسے نہیں آتیں۔ وہ اپنے ساجن کی خاطر سب کچھ کر سکتی ہے۔ سماج کے کڑے قوانین توڑ دیتی ہے۔ راہ کی رکاوٹوں اور حالات سے ٹکرا سکتی ہے۔ موقعہ پڑنے پر اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتی ہے اور زندگی کی صحرا میں تمام عمر اپنے محبوب کا انتظار کر سکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھی کی قدیم کہانیاں زیادہ تر حقیقی واقعات پر مبنی تھیں، جن پر بعد میں حکایتی اور ناصحانہ رنگ چڑھایا گیا ہے۔

سندھی لوک کہانیوں کے آئینے میں سندھ کے عوام کی اخلاقی، سماجی اور روحانی اقدار منعکس نظر آتی ہیں۔ خاص کر سندھی عورت کا حقیقی اور اصلی روپ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ''رسالو'' میں صوفی فلسفے کی گہرائی کے علاوہ ان لوک کہانیوں کے بیان کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہے۔ یہ وہ لوک کہانیاں ہیں جو سندھ کے علاقوں میں صدیوں سے رائج تھیں اور جن کو شاہ لطیف اور سندھ کے دیگر شعرا نے اپنی شاعری کا بنیادی موضوع بنایا ہے۔

سندھی لوک کہانیاں ویسے تو لاتعداد ہیں، لیکن سسی پنہوں، لیلاں چنیسر، سہنی میہار، عمر ماروی، مومل رانو، سعد تھ رائے ڈیاچ اور نوری جام تماچی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ یہ کہانیاں اگرچہ ایسے مافوق الفطرت واقعات سے بھری ہوئی ہیں جو مشرق میں بے حد پسند کی جاتی ہیں۔ تاہم ان میں خوبصورتی اور کشش کا فقدان نہیں ہے۔ ان میں سب سے اہم داستان سسی پنہوں کی ہے، جس پر شاہ لطیف نے زیادہ توجہ مرکوز کی ہے۔ ان میں سرسسی، سرآبری، سرمعذوری، سرکوہیاری، سرحسینی، سردیسی اور سرروپ ہیں۔ نظموں کے مجموعہ کا بڑا حصہ ان سروں پر مشتمل ہے۔ ان سات سروں میں شاعری کا معیار ذرا سا کھردرا ہے۔ سرحسینی جو کہ تنہا طول نظم ہے، سب سے زیادہ معیاری ہے۔ جبکہ سرروپ میں خوبصورت شاعری کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔

لوک کہانیاں ایک ایسی تخلیق ہیں، جو ایک نسل سے دوسری نسل کو ورثہ میں ملتی ہے۔ یہی حال سندھی لوک کہانیوں کا ہے۔ سندھ کی لوک کہانیوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک انسان کا ذہن غور وفکر کی قوتوں سے محروم نہیں ہو جاتا۔ جب تک انسان میں جلنے اور قربان ہونے کی تمنا ہے، تب تک لوک کہانیاں زندہ وجاوید رہیں گی اور یہی وجہ ہے کہ لوک ادب پر اتنے نشیب وفراز گزر جانے کے باوجود بھی یہ ادب عوام میں محفوظ ہے۔ اس میں اب بھی وہی اُٹھان اور وہی کشش، وہی سادگی اور وہی خلوص ہے۔ آج بھی جب سندھ میں تپتی ہوئی گرمی پڑتی ہے اور شام کو کھلے میدانوں میں چٹکی ہوئی چاندنی اپنا حسن دکھلاتی ہے، تو سندھ کے بھولے بھالے عوام اسی چاندنی میں انہی لوک کہانیوں، لوک گیتوں اور لوک ناچوں کے درمیان مستقبل کا ایک پرتو پاتے ہیں۔

سندھ کی لوک کہانیوں کی اہمیت کے بے شمار پہلو ہیں۔ اول تو اس میں انسانی جذبات کے قدیم ترین تصورات و جذبات کا تحفظ ہے اور ہر کہانی میں انسانیت کے ان اثرات کو نمایاں کیا گیا ہے، جو ایک ذمہ دار و صحت منداور ترقی یافتہ ماحول کے لیے ضروری ہے۔ اس محبوب فن کی مدد سے بے شمار سیاسی اور معاشرتی مسائل حل کیے گئے ہیں۔

سندھی لوک کہانیوں میں بالغانہ دور سے پہلے جادو، دیو، منتر، پریاں، جنات اور چڑیلیں انسان کی زندگی کے اہم جز تھے اور ان کی اپنی عملی زندگی میں ان چیزوں کا بڑا دخل تھا۔ جس طرح بہت پرانے کھنڈرات میں پرانی تہذیب وتمدن کے آثار نمایاں ہیں۔ بالکل اسی طرح لوک کہانیوں میں بھی پرانے نفسیاتی نظام اور ذہنی ارادوں کی جھلک موجود ہے۔ لوک کہانیوں کی ابتدا بالکل اسی طرح سے ہوئی، جس طرح سے بات کا بتنگڑ بن گیا ہو۔ یہ ذرا سی بات بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بعض اوقات سندھی لوک کہانیوں میں یہ بھی ہوا ہے کہ ان کی جگہ نئی شاخوں نے لے لی اور پرانی شاخیں کاٹ کر پھینک دی گئیں۔ سندھی لوک کہانیوں کی تعریف ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے اس طرح کی ہے کہ ”یہ فقیر کی ایک ایسی جھولی ہے، جس میں مختلف چیزیں جمع ہوتی گئیں یا لنگر کی ایسی دیگ ہے، جس میں جس کا جو دل چاہے ڈالتا چلا گیا اور کھچڑی پکتی گئی اور آخر میں یہ پتہ چلانا مشکل ہو گیا کہ دیگ کس کی ہے، کس نے چڑھائی تھی اور کب چڑھی تھی اور اس میں جو جو چیزیں شامل ہیں وہ کس کس نے ملائی ہیں۔

سندھی لوک کہانیوں کو ہم تین دور میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے کے دور میں طوطا، جادوئی لکڑی، دیو، پریاں، جن، بھوت، ڈائن اور چڑیلوں کے ذریعے کہانیوں کو ترتیب دیا گیا ہے اور ان کہانیوں میں طوطا، ہرن، سانپ، عقاب وغیرہ بہت اہم کردار ہیں اور کہانیوں کو یہی کردار آگے بڑھاتے ہیں۔ اس قسم کی کہانیوں کا نہ کوئی محل وقوع ہوتا ہے، نہ ان کے دور کا پتہ چلتا ہے۔ یہ عموماً اس طرح شروع ہوتی ہیں کہ ایک تھا راجہ اسے اولاد نہیں ہوتی تھی، وہ چورا ہے پر جا کر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ وہاں سے جوگیوں کا قافلہ گزرا اور انہوں نے کچھ شرائط کے ساتھ اس کے ہاں بچہ ہونے کی نوید دی، وغیرہ وغیرہ یا کسی کہانی میں کوئی شہزادہ کسی جادوگر کے جال میں پھنس جاتا۔ پھر کوئی درویش آتا ہے، اس کی مدد کرتا ہے، سانپ طوطا، عقاب اس کے مددگار ثابت ہوتے ہیں اور وہ کامیاب وکامران واپس لوٹتا ہے۔

بعض کہانیوں میں انسان اور پریوں کی محبت کی داستان کو مرکزی خیال بنا کر جادو کے قصوں کو پھیلایا گیا ہے۔ آخر میں ان کہانیوں میں نیک نام کرنے، برے کام سے بچنے اور ظالم پر قابو پانے کی تلقین کی جاتی ہے۔

دوسرے دور کی کہانیوں میں کچھ تاریخی کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے محل وقوع، ہیرو، ہیروئن کے نام اور ان کے خاندان کے آثار کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان کہانیوں میں بھی برے ماحول سے بچنے اور نیک کام کرنے کی طرف اشارے ہوتے ہیں۔

تیسرے دور میں سندھ کے حکمرانوں کے مشہور کردار تاریخی حیثیت سے نمایاں ہیں۔ ان کے معاشقے، ان کی داستانیں عام ہیں۔ ان کے دور کے متعلق پوری پوری معلومات ہوتی ہے اور ان کے متعلق راوی پورے وثوق کے ساتھ کچھ کہہ سکتے ہیں۔ ان کہانیوں میں عمر ماروی، مومل رانو، سسی پنہوں، نوری جام تماچی وغیرہ قابل ذکر ہیں اور ان کی یادگاریں آج بھی سندھ میں موجود ہیں۔ اس قسم کی کہانیوں کو سندھ کے بہت سارے شعراء نے ماضی میں الف ب سے یے تک منظوم کیا ہے۔ تیسرے دور کی کہانیوں کا زمانہ سولہویں صدی عیسوی میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس دور کے بعد سندھ کے سرتاج الشعراء حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا دور شروع ہوتا ہے۔ سندھ کے دوسرے صوفیائے کرام نے بھی شاہ عبداللطیف بھٹائی کی طرح ان کہانیوں کا سہارا لے کر عشق حقیقی کا فلسفہ سمجھایا ہے۔

دوسری لوک کہانیوں کی طرح سندھ کی لوک کہانیوں کے بارے میں بھی یہ بات نہایت اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ معلوم نہیں کہ ان کی کب ابتدا ہوئی اور کہاں انتہا ہوئی، کس طرح ہوئی اور ان کی بنیاد کس نے رکھی۔ ان کہانیوں کی زیادہ تر ابتدا کسی کارنامے، کسی پریشان شخص کی مدد، کسی دلیر آدمی کی بہادری کے کارنامے کو اکٹھا کر کے بنیاد رکھی گئی ہے۔ پھر بادشاہوں، سرداروں نے عالموں اور دانشوروں کی مدد سے کچھ کہانیاں ترتیب دیں۔ جس میں جانوروں کی زبانی حکایتیں بیان کر کے حکمت عملی کے گر سمجھائے گئے۔ سندھ کی لوک کہانیوں میں ماضی کے ارتقائی تحریک کے آثار ملیں گے۔ جس میں جادو کے کرشمے اور بادشاہوں اور شہزادوں کے کارنامے ہوں گے۔ غرض کہ سندھ کی لوک کہانیوں میں آپ کو اس قسم کے اشارے زیادہ سے زیادہ ملیں گے۔ جس میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہوگی کہ نیک نام زندہ رہتے ہیں اور برے نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

سندھ کے مقبولِ عام شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ان لوک کہانیوں میں بڑے فلسفیانہ نکتے تلاش کیے ہیں اور ان کے جستہ جستہ حصوں کو اپنے پیغام کو موثر طریقے سے پیش کرنے کا وسیلہ بنایا ہے۔ انہوں نے ان کہانیوں کو اس لیے منتخب کیا کہ عوام کی زبانوں پر یہ کہانیاں تھیں اور وہ انہیں اپنی ثقافت اور تہذیب کی میراث سمجھتے تھے۔ شاہ سائیں نے ان کہانیوں کی قبولیت عام سے فائدہ اٹھایا اور ان کہانیوں کے سبق آموز عناصر کو بڑے دلکش ابیات میں ڈھال کر اپنے فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار کی نشر و اشاعت کی۔ شاہ سائیں غم و تلاش کا ایک منفرد مقصد رکھتے تھے۔ وہ محبوبِ حقیقی کو تلاش کرنے والے کو عزم اور پختہ یقین رکھنے کی تلقین کرتے ہیں کہ اس میں یقین سے ہی منزلِ مقصود تک پہنچ ہو سکتی ہے۔

معروف شاعرہ نسیم خان سیما کی نئی کتاب ''آدھی گواہی''

لاہور (ادبی رپورٹر) معروف شاعرہ اور مصنفہ نسیم خان سیما کی شاعری کی نئی کتاب "آدھی گواہی" شائع ہو کر مارکیٹ میں آ گئی ہے۔ یہ نئی کتاب پاکستان کے معروف اشاعتی ادارے قلم فاؤنڈیشن نے شائع کی ہے۔ مصنفہ کی اس سے قبل کئی کتب شائع ہو کر علمی و ادبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آدھی گواہی عورت کے حوالے سے ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس کا انتساب انہوں نے اپنی مرحومہ والدہ صفیہ بی بی کے نام کیا ہے۔ شاعری ان کی پہچان بنی ہے۔ قبل ازیں ان کے حمدیہ اور نعتیہ مجموعوں سمیت چھ کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔ آدھی گواہی نام پڑھتے ہی قرآن مجید کے حوالے سے عورت کی آدھی گواہی کا مضمون ذہن میں آ جاتا ہے۔ اور ان مغرب زدہ آزاد خیال خواتین اور آنٹیوں کا خیال بھی آتا ہے جو کلام پاک میں عورت کی آدھی گواہی پر طعنہ زن رہتی ہیں۔ لیکن کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے مصنفہ نسیم خان سیما صرف شاعرہ ہی نہیں ہیں بلکہ اسلام کی بیٹی بھی ہیں اور دینِ اسلام کی تعلیمات پر مکمل یقین رکھتی اور عمل کرتی ہیں اور اپنی شاعری عورت کے اس مقام و مرتبے کا اظہار کھل کر کرتی ہیں، جو دین برحق نے عورت کو دیا ہے اور معاشرے سے عورت کے لیے اسی مقام و عزت کی متمنی ہیں جو مقام و مرتبہ اسلام عورت کو دیتا ہے۔ گویا "آدھی گواہی" اس قرآنی حکم کی تفسیر ہے۔ اس خوبصورت کتاب کا مطالعہ ہر صاحب ذوق کے لیے اور خصوصاً خواتین کے لیے ان کی علمی اور شعر و ادب کے شوق کی تسکین کا باعث ہوگا۔ 136 صفحات کی کتاب کے ابتدائی صفحات فور کلر اور خوبصورت ڈیزائن کیے گئے ہیں ٹائٹل پر مصنفہ کی باوقار تصویر ہے کتاب پر رائے دینے والوں میں جناب جبار مرزا، ڈاکٹر یوسف عالمگیر، ڈاکٹر مقصود جعفری شامل ہیں۔ قلم فاؤنڈیشن کے حسب روایت عمدہ کاغذ اچھی اور معیاری کتابت و طباعت کے ساتھ کتاب پیش کی ہے۔ جلد مضبوط اور قیمت انتہائی مناسب ہے۔ حصول کتاب کے خواہش مند قلم فاؤنڈیشن کے مرکزی دفتر واقع یثرب کالونی بینک سٹاپ والٹن روڈ لاہور کینٹ پر تشریف لائیں یا ایک خط لکھ کر اپنی کاپی بک کرائیں۔ آفس کے نمبر پر بھی رابطہ کیا جا سکتا ہے جو کہ درج ذیل ہیں۔ 042-36612786-7 یا موبائل نمبر 0300-0515101 پر کال کریں یا ای میل کریں

qalamfoundation2@gmail.com

❀❀❀

افتخار شوکت/ لاہور

منت سے ملا مجھ کو نہ منت سے ملا تھا
یہ مرتبۂ عشق رفاقت سے ملا تھا

تھی ملنے کی جتنی بھی خوشی دکھ بھی تھا اُتنا
وہ مجھ سے رقیبوں کی اجازت سے ملا تھا

اتنی ہی سہولت سے گنوا بیٹھا میں اس کو
وہ شخص مجھے جتنی سہولت سے ملا تھا

میں اس کے لیے کیوں نہ دل و جان لٹاتا
وہ مجھ کو فقط عشق کی نسبت سے ملا تھا

چلتی نہ بھلا کیسی کوئی پھلجھڑی مجھ میں
شوخی سے ملا تھا وہ شرارت سے ملا تھا

اے ربِ سخن فضل ہو ایسا کہ ملے جو
وہ سب کو بتائے کہ میں شوکت سے ملا تھا

ڈاکٹر شمیم آزر کی کتاب ''خواب خواب اندیشے'' کی تقریب رونمائی

رپورٹ: سکندر ابوالخیر

شمیم آزر کی شاعری براہ راست دل پر اثر کرتی ہے، ان کے امتیازات میں زبان کا خلاّقانہ استعمال شامل ہے۔

ان خیالات کا اظہار اردو ادب کے انتہائی معتبر شاعر جناب ولی عالم شاہین صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں کیا۔ مسی ساگا کے کمیونٹی سینٹر میں ارباب قلم کینیڈا کی جانب سے منعقدہ، ڈاکٹر شمیم آزر صاحب کی کتاب ''خواب خواب اندیشے'' کی تقریب رونمائی اور مکالمے کی محفل میں آٹوا سے خصوصی طور پر تشریف لائے تھے۔ کینیڈا میں مقیم بزرگ ترین عالمی شہرت یافتہ شاعر جناب ولی عالم شاہین صاحب خود سات شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ ان کی اس محفل میں شرکت اس کو زینت اور اعتبار فراہم کرنے کا ذریعہ اور کامیابی کی ضمانت تھی۔ ڈاکٹر شمیم آزر صاحب کی خوبصورت کتاب کی تقریب رونمائی میں آپ کے چار چاند لگاتے کلیدی خطبے نے آزر صاحب کی شاعری اور ان کی کتاب پر مفصل اور باریک بینی کے ساتھ روشنی ڈالی۔ یہ خطبہ تمام ادب دوست حاضرین کی سرشاری کا باعث رہا۔

شاہین صاحب نے شمیم آزر کی شاعری پر بات کرتے ہوئے اسے دل کی شاعری قرار دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ گورکھپور کی خاک، پانی، ہوا اور آگ کے آمیزے میں ڈھاکہ، کراچی، ملائشیا، جزائر غرب الہند اور شمالی امریکہ کے بیشتر نامعلوم گوشوں کو اندیشہ ہائے دور دراز کی تلوار کے سائے تلے منور کرنے کے عمل میں گردش ایام کے کتنے اثرات قبول کیے اس کا جائزہ لینا آسان نہیں ہے۔ شمیم آزر نے بہت جہاں گردی کی ہے، ان کی روداد یقینی طور پر دلچسپ ہوگی۔ اور اسی کے ساتھ انسانی نفسیات کے شیشہ و آہنگ سے ٹکرانے کا لامتناہی سلسلہ بھی کم دلآویز نہیں ہوگا۔ شمیم آزر باصلاحیت باہمت، نیک صفت اور انسانیت کا درد رکھنے والے خوش مزاج انسان ہیں جن کی قدریں کشمکش کے دوران بھی ماند نہیں پڑتیں۔ شمیم آزر اپنے جذبات اور احساسات کی ثابت قدمی سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں اور اپنی ر?اضت سے اپنی فطری ودیعت میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں جہاں حد بندیاں ہیں وہیں شدت کی فراوانی بھی ہے۔ اچھے شاعر کی بڑی خصوصیت اس کا اپنی حدود کا پتہ ہونا ہے اور شمیم آزر اس ہنر سے واقف ہیں۔

ان کا شعری مجموعہ خواب خواب اندیشے بڑی حد تک ان کی شخصیت کی توسیع بھی ہے۔ ان کی شاعری میں پیشہ ورانہ ماحول کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ تعلیم کے دوران، قبل اور بعد کے مراحل کے مختلف پڑاؤ پر ٹھہراؤ اور تضاد کے عمل نے اس میں دلکشی پیدا کی ہے۔ وطن سے محبت اور اس کے دگرگوں حالات کا نوحہ اور مایوسی کے حالات میں رجائیت کی جھلکیاں ان کی شخصیت میں کئی شخصیتوں کی موجودگی کا اظہار کرتی ہیں۔ ان حالات میں تصادم کا شائبہ کچھ زیادہ ہی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ شاعر کا کام سوال پیدا کرنا ہوتا ہے اور ان کی شاعری اس میں کامیاب ہے۔ فکر و فن کے امتزاج نے ان کی شاعری کے حق میں سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔ بزم آرائی کے فنکارانہ شعری اظہار میں بین السطور ایک مہذب تربیت یافتہ ذہن نمودار ہوتا ہے۔

شمیم آزر نے ڈاؤ میڈیکل کالج کے احاطے میں ''یم یم'' کے درخت کو بطور خاص اس طرح جگہ دی ہے کہ وہ ایک شعری علامت بن گیا ہے۔ یہ کہنہ درخت ایک قابل اعتبار راز دار اور غم گسار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

شمیم آزر کے امتیازات میں زبان کا خلاقانہ استعمال اور سلاست شامل ہیں۔ اس میں ابلاغ بہت ہے اور پیچیدگی سے مبرا ہے اور بغیر کسی رکاوٹ کے دل میں اتر جاتی ہے۔ انہوں نے کسی ادبی تحریک یا رجحان کا سہارا نہیں لیا، ان کی فکر کا منبع آس پاس کی دنیا، ذات و کائنات کے مظاہر، انسانی قدروں کی پاسداری اور اپنے مطالعے کی قوس قزح کی عطا ہے۔ سچی بات اپنے انداز میں کہنا اچھی شاعری کی اساس ہے، شمیم آزر یہ ہنر جانتے ہیں۔ ان کی قادر الکلامی ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ولی عالم شاہین صاحب نے شمیم آزر کے منتخب اشعار سنائے:

میں چاہتا تھا پلٹ آؤں اس سفر سے اب
پر اس سفر میں پلٹنے کی رسم تھی ہی نہیں

اعتماد ایسا بلکتے ہوئے بچے کے لیے
ڈھونڈ ہی لایا تھا صحراؤں میں پانی کوئی

موسم کے سرد ہاتھ کسی بیوفا کے تھے
سوکھے ہوئے وہ پیڑ تو زخمی ہوا کے تھے

ہم ملے ترک تعلق کے ارادے لے کر
کیسے دکھ سونپ گئے قرب کے لمحے اب کے

ولی عالم شاہین/کینیڈا

آیتِ صبح سرِ آب کنول ہے میرا
اک گلی ہے کہ جہاں تاج محل ہے میرا
اپنے ہی جسم سے میں اپنی زمیں ناپتا ہوں
نصب جو میل کا پتھر ہے خلل ہے میرا
کوئی مقدونیہ سے آئے کہ غزنی سے چلے
غیر مفتوح یہ ایوانِ غزل ہے میرا
میری خاطر ہی چھلکتا ہے یہ پیمانۂ گل
یہ ازل اور یہ ابد اور یہ پل ہے میرا
کسی وقفے میں بھی دَم لینے کی مہلت کم ہے
رزمِ ہستی ہے مری شورِ اجل ہے میرا
ایک ہی رنگ میں رنگوں کی عجب چھوٹ سی ہے
دیکھنے میں تو یہی آج بھی کل ہے میرا
دیکھ بھال اُس کی مری گم شدگی ٹھہری تھی
اب جو کھویا ہوں تو دانستہ عمل ہے میرا
تھا سروکارِ غمِ دل تو سدا کا معمول
معرکہ اتنا کٹھن پہلے پہل ہے میرا
ٹوٹ کر بھی نہ ہوا میں کبھی افسردہء عشق
دل کی لہروں سے جو رشتہ ہے اٹل ہے میرا
دینے والے ہوئے تم کون؟ تمہارا کیا ہے؟
باغ میرا ہے زمیں میری ہے پھل ہے میرا

کم پڑتی ہے رات اگرچہ دن ہیں مرے بھرپور
شعر کے تیر سے جی اٹھتا ہوں میں گھائل مزدور
دشمن میری ہم قدمی پر خیر سے ہے مجبور
وہ بھی شاید میری طرح ہے اندر سے معذور
میں تسلیم و رضا کا خوگر ملکِ خدا سے دور
خیر تو مانگوں شاہ و گدا کی، بھیک نہیں منظور
تھا یہ نظر کا تول چکایا اپنے دل کا مول
سودائی میں اپنے درد کا اپنی آنکھ کا نور
جاتے جاتے جائے گی وحشت خوش پندار سیانوں کی
میں بھی اپنے بُرے دنوں میں کم نہ رہا رنجور
دوڑتے بھاگتے قافلوں کا اب روز کا ہے معمول
نیل کا دریا پار کریں اور آنکھ میں بھر لیں طور
وصل کی رات بھی ان کے ستاروں کی چشمک کچھ کم نہ ہوئی
مکروہاتِ وجود کی زد میں آئے ہوئے مہجور
بادِشمال کی سائیں سائیں میں پلکوں پر جھک آئیں گھٹائیں
رم جھم نے شاہین بڑھایا اور بھی سُر میں سرور

خود سے بھی پرے نکل گیا ہوں
تیرا ہوں، پر اپنا تجربہ ہوں
سورج ہوں اور سایہ مانگتا ہوں
میں اپنی تپش کا واہمہ ہوں
ہجرت کے نصیب کا لکھا ہوں
پتھر کا سراب ہو گیا ہوں
ہے دھوپ بھی اور برہنہ پا ہوں
کانٹوں کو لہو سے سینچتا ہوں
پیوند ہیں گرچہ پیرہن میں
آ دیکھ میں آج بھی نیا ہوں
دہشت ہے ادب میں حکمراں اب
میرا ہے جگر کہ جی رہا ہوں
وہ اپنی نگاہ میں خدا تھا
میں بار کشش سے گر پڑا ہوں
ہیں بند فلک کے سارے رستے
میں اپنی دعا کا معجزہ ہوں
آنکھوں میں ہے سارے دل کا سونا
مٹی کے دیے میں جل رہا ہوں
دن، پیڑ، اور رُت سے ہیں سبھی رنگ
پت جھڑ کا مزاج آشنا ہوں(۱)
اے میرا حساب کرنے والے
میں خود سے نجات پا چکا ہوں
دنیا تو مرے ہی نام کی تھی
ماٹی میں نہال ہو گیا ہوں
تھے لفظ کے رنگ اُڑے اُڑے سے
صیقل انہیں کر کے رکھ رہا ہوں
یہ شعر تو بولتا بہت ہے
عاجز بہت اس سے آ چکا ہوں
یہ زخم عطا ہے جس ہوا کی
پتھر اسی سمت پھینکتا ہوں
بستر پہ نحیف ہاتھ پکڑے
تا دیر نشے میں جھولتا ہوں
دھوتا ہوں تمام داغ دھبے
پانی سے بھی جرح کر رہا ہوں
شاہین ہے کون سا یہ کعبہ
کہتے ہوئے شعر مڑ گیا ہوں

---

(۱) کینیڈا میں خزاں کے رنگوں کا انحصار دن کی لمبائی، درختوں کی اقسام، اور موسمی حالات پر ہوتا ہے۔ درجۂ حرارت زیادہ ہو تو رنگ مدھم پڑ جاتے ہیں۔ شاہین

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

بھولا ہوا ناخدا

میرے ناخدا
میں تو ہوں اک ناتواں نسوانی خاکہ
جرم جس کا آفاقی ہے
بدن بھی پورا خاکی ہے
لہٰذا
پنجے گاڑھے ہوئے ہیں آقا

لہو سے میرے ہذیانی سیراب ہوتے ہیں
میرے دامن میں نوچے ہوئے خواب ہوتے ہیں
وہ تو وارفتہ بھی نہیں ہوتے
جو زیرِ عتاب ہوتے ہیں

میرے ناخدا
میں تو ہوں اک ناتواں نسوانی خاکہ
حلول ہوتی ہوئی روح کے کانوں میں
لوہے کے بجنے کی گونج آتی ہے
جیسے سینے پہ زخم کھائے ہوئے
آسماں سے گرتی ہوئی کونج آتی ہے

میرا معاملہ اور میرے سانسوں کی ترتیب
سب سے جدا ہے
جو مجھے کب کا بھلا چکا
وہ اب بھی میرا ناخدا ہے

بھونچکا سا ناگ

اے نرتکی تیرے یہ سوادک نرت بھاؤ
خمیدہ ہوئی جیسے ابرو کمان
اور کومل کایا تیری کا ٹھہرا سبھاؤ
شب باشی کے بعد بھی التجائیں
ہیں ابھی باقی سے کی گھڑیاں
نہ جاؤ ابھی نہ جاؤ
اے بلا کی حسین اے نازک سی جات
تیرے ماتھے میں لیکن بندیا میں آگ
تیرے کاندھے پہ بیٹھا بھونچکا سا ناگ
چھیڑے ہے تو جب بھیریں کا راگ
ہوش اُڑتا افسوں
چیخے کیول نہ جاگ

یہ تیرا افسوں، موہ مایا، سواد
منور نجک سہی لیکن جانے کے بعد
بیاکل بنے کئی صدیوں سے من
دور خوابوں میں ہو کوئی ویراں محل
اور اُس پر گرتی رہے وقفے وقفے سے رعد

محبت کر نہیں سکتے

برفیلے جاڑوں کے آنگن میں
مرمریں کلیوں کا کھلنا بنتا نہیں
کیونکہ
ان چاہے جذبوں کے جزیروں میں
وارفتگی نامی پودا اُگتا نہیں
ساحلوں پہ دیکھو
یہ ناریل کے پودے کیسے ساتھ کھڑے ہیں
مگر ان کی شاخیں
ان کے سر کے اوپر
جیسے ناگ پھن پھیلائے کھڑے ہیں
محبت ہونے نہیں دیں گے
بس اسی بات پر اڑے ہیں
کہ
محبت کے سودے کڑے ہیں
لگتا ہے پھر بھی یہ ساحل بلا رہے ہیں
آؤ پیار کرنے والو!
یہاں گھومو
ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چہل قدمی کرو
سمندر کی ہوا تمہیں تھپکیاں دینے کے لیے ہے
یہ ملگجی روشنی تمہارے لیے ہے
مگر نہ جانے کیوں دل کہتا ہے
یہ جو ناریل کی شاخیں سرسرا رہی ہیں
بتا رہی ہیں
یہاں محبت ہو نہیں سکتی
یہاں محبت کر نہیں سکتے

چاند چمکتا رہتا ہے

شدتِ غم سے چاند بوجھل ہے
کوہ آرارات پر چڑھ کر دیکھو
کوئی تارہ ٹوٹ گیا، لگتا ہے
کوئی کشتی تو اُس کی آنکھ سے اوجھل ہے
تاروں پہ پھول اُگتے رہتے ہیں
اپنی ہی خوشبو سے وہ سلگتے رہتے ہیں
سینوں میں ٹھنڈک لانے کو
وہ چاندی کی کرنیں چگتے رہتے ہیں
پھر تارے تو ٹوٹتے رہتے ہیں
اور پھولوں کے مقدر بھی
تاروں کی آتش بازی میں
پھوٹتے رہتے ہیں
ہاں لیکن اپنوں کے اوجھل ہونے سے
دل زخمی کے بوجھل ہونے سے
تارے پھر بھی ٹوٹتے رہتے ہیں
اور چاند چمکتا رہتا ہے

جاپان کا بڑھاپا اور اکیلا پن

شہزاد علی بہلم/ جاپان

دوستو! جاپان میں اس وقت بوڑھے لوگوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے جاپان میں اس وقت بچوں کی پیدائش ایک پرسنٹ سے بھی کم ہوگئی ہے، یعنی ایک میاں بیوی اوسطاً ایک بچے کی پیدائش بھی نہیں ہے وجہ؟ جاپان میں لڑکیاں اور لڑکے شادی نہیں کرتے کوارے ہی مرجاتے ہیں کیونکہ جاپانی شرمیلی قوم ہے، دوسرا اگر شادی کر بھی لیں تو بچے پیدا نہیں کرتے وجہ؟

کیونکہ جاپانی عورت اگر شادی کرے گی تو اپنی زندگی اپنے شوہر کی خدمت کے لیے وقف کریں گی اور اگر شوہر سے بچہ پیدا کر لیا تو اپنی زندگی بچے کے لیے فنا کریں گی بس مرتے دم تک بچے کے لیے کام اور اپنی محبت وقف کریں گی اور نوکری بھی کریں گی گھر بھی سمبھالیں گی پھر شوہر بیچارا بھی زیرو ہو جاتا ہے ان کی نظر میں۔۔

بچے پیدا کرنے کے بعد یہی بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو علیحدہ رہتے ہیں کیونکہ جاپان میں ساتھ رہنے کا کلچر نہیں، چاہے برابر میں کوئی فلیٹ کرائے پر لے لیں گے مگر ساتھ نہیں رہیں گے یہ کلچر ہے جاپان کا۔

اب تو پاکستان کے بڑے شہروں میں بھی بچے ساتھ نہیں رہتے، یہی وجہ ہے کہ عقلمند لوگ سوچتے ہیں کہ جب بچے ساتھ ہی نہیں رہیں گے تو پیدا کرنے کا کیا فائدہ۔ ایک بچے کو جاپان میں پالیں تو پالنے کا خرچہ دس کروڑ پاکستانی آتا ہے جب تک کہ بچہ بڑا ہو کر یونیورسٹی سے فارغ نہیں ہو جاتا—اب جاپانی سوچتے ہیں کہ ہم بچوں کے لئے کمائیں یا ہم خود اپنی زندگی عیش کے ساتھ گزاریں جاپانی بہت فاسٹ، ڈیسپلنز اور عقلمند قوم ہے، یہی وجہ ہے زیادہ تر لوگ بچے پیدا نہیں کرتے۔

اب اس کا نقصان دیکھتے ہیں انسان نے جب بھی نیچرل کے خلاف کام کیا ہمیشہ نقصان ہی اٹھایا—

آج مجھے ایک جاپانی کا درد بھری آپ بیتی کا پتہ چلا تو لکھے بغیر نہ رہ سکا، ایک جاپانی جو کہ 80 سال کا ہے اس کی بیوی بھی 80 سال کی ہے یہ دونوں میاں بیوی نے بھی کوئی بچہ پیدا نہیں کیا، اور یہ جاپانی دوست جاپان میں آٹھ کمپنیوں کا مالک ہیں پچاس ساٹھ افراد اس جاپانی دوست کے پاس کام کرتے ہیں اب یہ کئی دفعہ میرے پاکستانی دوست کے پاس آتا ہے اور اُسے کہتا ہے کہ میں دو تین سال میں مرجاؤ؟ں گا میں نے 45 سال رات اور دن کام کر کے اتنی بڑی کمپنیاں بنائی، اب یہ سب بیکار ہوتا نظر آرہا ہے جاپانی کہتا ہے میرے مرنے کے بعد کون کمپنی چلائے گا کون سمبھالے گا۔ کیا بنے گا جاپانی آئے دن میرے پاکستانی دوست کے پاس آتا ہے اور اُسے آفر کرتا ہے کہ میری کمپنی سمبھال لو تا کہ کوئی تو اس کمپنی کو لے کر چلے میرا پاکستانی دوست بھی اچھا اور نیک انسان ہیں پاکستانی دوست کہتا ہے کہ میری عمر بھی اب ہو رہی ہے میرا اپنا پتہ نہیں کب مرجاؤں۔ جاپان میں اللہ نے مجھے سکون کا بزنس دیا ہے میں سکون سے رہنا اور مرنا چاہتا ہوں میں کیونکہ اب ساٹھ سال سے اوپر ہو گیا ہو اور میرا ایک ہی بیٹا ہیں مجھے اب ضرورت نہیں جب میں نے یہ ساری اسٹوری سنی تو مجھے اُس جاپانی دوست پر ترس آیا۔

اتنا بیچارا اتنا بے بس کہ 45 سال کام کیا اب اس کمپنی کو سمبھالنے والا کوئی نہیں پانچ چھ سال بعد مرجائے گا یہ اُس جاپانی دوست کو پتہ ہے، دوستوں اُس جاپانی دوست نے گھر میں AI ریموٹ لگایا ہوا ہیں اور ChatGPT سائٹ لی ہوئی ہے اب AI کمپوٹر سے باتیں کرتا ہے۔

دوستوں دنیا میں انقلاب پیدا ہونے جا رہا ہے، اب ہماری آنکھوں کے سامنے جاپان میں بوڑھے لوگ Ai کمپوٹر سے باتیں کریں گے انسان کے پاس ٹائم نہی ہوگا دس سال پہلے ایک انگلش فلم آئی تھی FuturetheBack to خدا قسم آج وہی ہونے جارہا جاپانی دوست کا کیا بنے گا پتہ نہی مگر ایک بات سمجھ میں آ گئی ہیں آپ نیچر قدرت کے خلاف جو کام کریں گے نقصان اوٹھائیں گے جاپان میں ایسی ہزار و کمپنیاں ہیں جن کے مالک اکیلے ہیں نہ کوء بچہ نہ کوء رشتہ دار اب ان جاپانیو نے نیٹ پر دے رکھا ہیں کہ کوء ہماری کمپنی کو آگے لے کر چلے کیونکہ انھیں پتہ ہیں اب عمر ہوگئی ہیں انھیں بھی مرنا ہیں دوستوں انسان اچھے مستقبل اور اپنی طرف سے کیا کیا سوچتا ہیں مگر ہوتا وہی ہیں جو خدا چاہتا ہیں جاپانی دوست کی بے چارگی پر ترس اتا ہیں انسان اتنا بے بس لاچار ہیں انتہاں ہیں بے بسی کی۔

بہت سے لوگ، بلکہ 99.99% لوگ، کہتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد کے لیے کماتے ہیں۔ اولاد تو بیچاری صرف وقت ضائع کرتی ہے، پیسہ نہیں کماتی۔ باپ کہتا ہے کہ میں اپنی اولاد کے لیے کماتا ہوں، چاہے وہ حرام ہو یا حلال، جبکہ میرے جیسے لوگ صرف اپنے لیے جیتے ہیں اور اپنے لیے کماتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو اولاد قدرت کے قانون کے مطابق پیدا کی گئی ہے، اسے اچھی دنیاوی اور دینی تعلیم دینی چاہیے اور پھر اسے خود مختار بنا کر دنیا میں اپنا مستقبل بنانے کے لیے بھیج دینا چاہیے۔ جب میں یہ نظریہ کسی کو بتاتا ہوں، تو لوگ مجھے اندھا سمجھتے ہیں، لیکن انسان اپنی حد دردی کرتا رہتا ہے۔

امریکہ کے ایک گاؤں میں ایک بیماری پھیل رہی تھی جہاں ایک مکھی لوگوں کی آنکھوں پر انڈے دیتی تھی، جس سے بینائی ختم ہو جاتی تھی۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ اندھے تھے۔ میں، جو شادی کا شوقین ہوں، اس گاؤں میں بیماری کا علاج دریافت کرنے گیا اور وہاں کی سردار کی حسین بیٹی پسند آگئی۔ میں نے سردار سے رشتہ مانگا، لیکن سردار نے کہا کہ اگر تم شادی کرنا

چاہتے ہو تو پہلے اپنی دونوں آنکھیں ضائع کرو۔

میں نے سوچا کہ اگر میں اپنی دونوں آنکھیں ضائع کر دوں تو اس عورت کا حسن میرے کس کام کا؟ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں شادی نہیں کروں گا اور رات کی تاریکی میں بھاگ جاؤں گا۔ صبح گاؤں والوں نے مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن میں بھاگ چکا تھا۔

مقصد بات کا یہ ہے کہ پانچ ہزار سال سے ماں باپ کی یہی شکایت ہے کہ اولاد ان کا کہنا نہیں مانتی۔ والدین جو حرام حلال کما کر، دن رات محنت کر کے اولاد کے لیے سب کچھ کرتے ہیں، وہ صرف اپنے دل کی تسلی کے لیے کماتے ہیں، نہ کہ اولاد کے لیے۔ انسان اپنی تسلی اور فخر کے لیے دولت کماتا ہے، نہ کہ اولاد کے لیے۔

میرے نظریے کے مطابق، جو لوگ دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی اندھے رہتے ہیں اور سچ نہیں کہتے، وہ اندھے لوگوں کو نظر کا چشمہ بیچنے کے مترادف ہیں۔ پانچ ہزار سال پرانی کتابوں میں بھی یہ شکایت موجود ہے کہ اولاد ماں باپ کا کہنا نہیں مانتی اور زیادہ تر اپنی بیوی بچوں کو اہمیت دیتی ہے۔

میں اکثر اپنے بھائیوں سے کہتا ہوں کہ بھائی، بھائی ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو سمجھاتے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا، جبکہ بیوی لٹا کر سمجھاتی ہے تو فوراً سمجھ میں آجاتا ہے۔ میرا نظریہ مہذب پر نہیں بلکہ پانچ ہزار سال پرانی کتابوں پر مبنی ہے۔ پانچ ہزار سال سے آج تک ماں باپ کی یہی شکایت رہی ہے کہ اولاد نافرمان ہے۔ جبکہ اصل غلطی ماں باپ کی ہے جو ساری زندگی اپنے لیے کماتے ہیں، لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں، اپنے لیے مکاری کرتے ہیں، بھائی کو بھائی سے دغا دیتے ہیں اور بیوی بچوں کی حمایت کرتے ہیں تاکہ بڑا ہو کر وہ ان کا فرمانبردار رہے۔

پھر کہتے ہیں کہ سب کچھ اولاد کے لیے کیا، بیچاری اولاد۔ مرد زندہ باد!

”حسین ہاتھ کا کنگن“

حمیرا جمیل، سیالکوٹ

کاش میں تیرے حسین ہاتھ کا کنگن ہوتا
اپنی نازک سی کلائی میں چڑھاتی مجھ کو تو بڑے پیار سے
بڑے چاؤ سے بڑے مان کے ساتھ
اور بیتابی سے فرقت کے خزاں لمحوں میں
تو کسی سوچ میں ڈوبی جو گھماتی مجھ کو
میں تیرے ہاتھ کی خوشبو سے مہک سا جاتا

حقیقی دنیا سے خیالات کی دنیا کا رنگین سفر شاعرانہ بات چیت کے ذریعے ہی طے پاتا ہے۔ میری کنگن خریدنے کی۔ شاعر کے کلمات دل کو موہ لیتے ہیں کیونکہ جو کچھ وہ کہتا ہے یا کہنے کی کوشش کرتا ہے لازم نہیں وہ حقیقت ہوں۔

خواہش حسرت بنتی چلی جارہی ہے۔ دراصل جس کنگن کی بات وصی شاہ اپنی نظم میں کر رہے وہ کس طرح کا کنگن ہے سوچتی ہوں کہ وصی شاہ سے دریافت کرنے کی کوشش کروں تاکہ جستجو کا مرحلہ آسان ہو سکے۔ پھر جو بات ذہن میں۔ ابھی تک حسرت بھری نگاہوں سے امید لگائے بیٹھی ہوں...... ہو سکتا ہے کہ وہ کنگن میری کلائی کی زینت بن جائے؟ وہ بناوٹ کے اعتبار سے کیسا ہے؟ میں اُس کنگن کی تلاش میں ہوں۔ تاکہ حسین ہاتھ کو مزید چار چاند لگ سکیں۔ مگر صبح سے شام شام سے پھر رات تک کا وقت پر کشش اور نایاب کنگن کی یاد میں گزر جاتا ہے۔ سوچ کے دائرے میں جس گردش کرتی ہے کہ ملاقات آسانی سے ہوجائے...... یہ بھی ناممکن ہے۔ میرے دل کی آرزو دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح سے یاد ہے جب یہ نظم ہر چھوٹے بڑے کو ازبر تھی۔ وقت گزرتا گیا مگر اس نظم کی مقبولیت۔ کہ کوئی عزیز میرا یہ پیغام وصی شاہ تک پہنچا دے...... تاکہ میری کچھ بے چینی ختم ہو سکے کنگن کو میں قید کر چکی ہوں...... وہ کنگن گمنامی کا شکار ہے۔ بات کو طول دینے کے بجائے مختصر یہی کہہ سکتی ہوں میں ہر روز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ عشق و محبت کی داستانیں یا آغاز محبت کے اظہار میں جان ڈالنے کے لیے ...... اس نظم کے اشعار نے صف اول کا کردار ادا کیا۔ نظم کے اشعار کو محبت کے وجود کی اہم کڑی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ عاشقان محبت کے لیے وصی شاہ کی یہ خدمت ناقابل فراموش رہے گی۔ صرف یہی ایک نظم نہیں بلکہ وصی شاہ کی تمام شاعری نوجوان نسل کے لیے پیام محبت ہے۔ نوجوان طبقے کو خصوصی طور پر وصی شاہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کم از کم کنگن کی وجہ سے صنف نازک کے حسن سے بخوبی آگاہ ہو سکے

میں تیرے کان سے لگ کر کئی باتیں کرتا
تیری زلفوں کو تیرے گال کو چوما کرتا
جب بھی تو بند قبا کھولنے لگتی جاناں
مجھ کو بے تاب سا رکھتا تیری چاہت کا نشہ اپنی
آنکھوں کو تیرے حسن سے خیرہ کرتا
میں تیری روح کے گلشن میں مہکتا رہتا
میں تیرے جسم کے آنگن میں کھنکتا رہتا
کچھ نہیں تو یہی بے نام سا بندھن ہوتا

بازو بند، انگوٹھی اور پازیب جیسے زیورات کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ شاعری میں صنف نازک کے حسن کا چرچا نہ ہو، خواتین کے بناؤ سنگھار اور خوبصورتی کو نکھارنے میں جھومر، ماتھا پٹی، بالی، جھمکا، رانی ہار، چندن ہار، گلوبند، مالا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ حتیٰ کہ خواتین کی تعریف میں یہی نہیں بلکہ شاعروں نے اپنے دیوان لکھ ڈالے ہیں۔ خواتین کی لطف اندوز ہونے کے لیے یہی بہت ہے...... بات تلخ ہے مگر سچائی پر مبنی ہے ایک عورت کے بعد دوسری عورت کی گنجائش۔ تیار ہیں۔ آرزو ایک ہی ہے کہیں سے کسی مقام سے پنکھڑی جیسے ہونٹ ہرنی جیسی چال والی دو شیزہ دکھائی دے جائے الڑھال رنگ روپ دیکھ کر بادشاہ سے لے کر ہر شعبہ زندگی سے منسلک مرد ہوش و حواس گنوا دینے کے لیے ہمہ وقت ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ شاید ہی سو فیصد میں سے دس فیصد مرد اپنی زندگی میں موجودہ عورت سے محبت یا عشق توجہ طلب موضوع وہی ہے" حسین ہاتھ کا کنگن"...

ادبی خبریں

☆ اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر انتظام قومی تقریب تقسیم اعزازات 11 تا 13 جون 2024ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوئی جس میں گزشتہ سات سالوں کے کمالِ فن ایوارڈز اور بہترین کتابوں کے قومی ادبی ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو سندات و اعزازات پیش کیے گئے۔

☆ اکادمی ادبیات پاکستان کے کتب خانے اور عجائب گھر کے لیے قلمی نسخوں، مخطوطوں اور نادر کتب کے حصول کے لیے مشاورتی اجلاس میں جن ماہرین مخطوطہ شناسی نے شرکت کی ان میں ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر سفیر اختر اور ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد شامل تھے۔ اجلاس صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان ڈاکٹر نجیبہ عارف کے دفتر میں منعقد ہوا۔ جس میں ڈائریکٹر جنرل سلطان ناصر ڈپٹی ڈائریکٹر محمد عاصم بٹ اور مدیر ادبیات اختر رضا سلیمی بھی شریک ہوئے۔ اجلاس میں پاکستان کی تمام زبانوں کی علمی و ادبی ورثے کی حفاظت پر زور دیا گیا۔

☆ ادب سرا کے زیر اہتمام نعتیہ مشاعرہ ویژن اکیڈمی نزد ایمپوریم مال جوہر ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوا۔ صدارت جناب واجد امیر نے کی۔ نظامت کے فرائض توقیر عباس توقیر نے ادا کیے۔ جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں اظہر عباس خان، وسیم عباس، سید فیصل اکرم گیلانی، سلطان محمود ہاشمی، محمد علی صابری، ڈاکٹر فخر عباس، ڈاکٹر عدنان خالد، محمد افضل ساجد، عدنان خالد و دیگر شامل تھے۔

☆ 11 جون 2024ء کو ممتاز نعت گو شاعر، نعتیہ شاعری کے اوّلین نقاد اور سچے عاشق رسولؐ رشید وارثی کی برسی کے موقع پر ایک بہت اہم اور خوب صورت پروگرام "رشید منہی" بہادر یار جنگ اکیڈمی میں منعقد کیا گیا۔ جس کا اہتمام نعت ریسرچ سینٹر، سیّد صبیح الدین رحمانی اور طارق بن آزاد نے کیا۔

☆ بزمِ پرنم کے زیر اہتمام معروف شاعر پرنم الٰہ آبادی کی یاد میں پندرہویں سالانہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں مختلف طبقہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی نمایاں شخصیات نے شرکت کی اور اپنے انداز میں پرنم الٰہ آبادی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ صدارت جسٹس (ر) نذیر احمد غازی نے کی۔ جبکہ مہمانانِ خصوصی میں نامور فلم ڈائریکٹر سیّد نور اور مقبول و معروف شاعر حسن عباسی تھے۔ دیگر مہمانانِ اعزاز میں سیّد محسن گیلانی، راشد محمود، معروف صحافی زوہیب سلیم بٹ، معروف ادیب ڈاکٹر سیّد قمر علی زیدی، ایم جمیل شیخ، ریاض احمد حسیم، نامور اُستاد شاعر اقبال راہی شامل تھے۔ پنجابی کمپلیکس قذافی اسٹیڈیم میں ہونے والی اس تقریب میں نظامت کے فرائض پروفیسر سلطان منیر نے احسن طریقے سے سرانجام دیے۔ اس موقع پر مہمانان اور حاضرین نے بانی و چیئرمین بزمِ پرنم، اقبال پیام کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے خراجِ تحسین پیش کیا۔ مختلف شخصیات کی دستار بندی و تقسیم ایوارڈ کے بعد نامور گلوکار اُستاد حامد علی خاں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے تقریب کو چار چاند لگا دیے۔ آخر میں بزمِ پرنم کی طرف سے اُستاد حامد علی خاں کی تاج پوشی کی گئی۔

☆ حلقہ اربابِ ذوق لاہور کا عید مشاعرہ پاک ٹی ہاؤس لاہور میں منعقد ہوا۔ اس شعری نشست کی صدارت جناب نذیر قیصر نے کی۔ جناب اشرف جاوید اور محترمہ حمیدہ شاہین نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ جن شعرائے کرام نے مشاعرے میں اپنا کلام سنایا ان میں عباس مرزا، ناصر بلوچ، عرفان صادق، جاوید قاسم، ممتاز راشد لاہوری، مختار کھرل، آفتاب جاوید، ڈاکٹر صغیر احمد صغیر، شوکت ناز، محترمہ روبینہ شاہین و دیگر شامل ہیں۔ سیکرٹری حلقہ ارباب ذوق محمد نواز کھرل نے نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔

☆ بزمِ علم و فن پاکستان (ہزارہ) کے زیر اہتمام لاہور سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر جناب سیّد جاوید کے شعری مجموعے "رنگ ڈھلتی شام کے" کی تقریب پذیرائی ماڈرن ایج پبلک اسکول و کالج (گرلز کیمپس) ایبٹ آباد میں منعقد ہوئی جس کی صدارت نامور بزرگ شاعر سلطان سکون نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض عبدالوحید بسمل نے ادا کیے۔ کتاب کے حوالے سے معروف شاعر جناب امتیاز الحق امتیاز نے پرمغز مقالہ پیش کیا۔ معروف شاعر اور ماہر تعلیم واحد سراج نے سیّد جاوید کے شعری سفر پر عمدہ گفتگو کی۔ سیّد جاوید نے اتنی شاندار تقریب کے انعقاد پر شکریہ ادا کیا۔ صاحب صدر سلطان سکون نے خطبہ صدارت میں سیّد جاوید کے ساتھ دیرینہ رفاقت کے حوالے سے عمدہ خطاب فرمایا۔

یہی ہے آرزو میری بنے مدفن مدینے میں

پُرخلوص اور راست باز شاعر کو کہنہ مشق نثر نگار پر فوقیت حاصل ہوتی ہے

ممتاز سیرت نگار، شاعر، سفرنامہ نویس، کالم نگار،
اقبال شناس، ماہر تعلیم اور شعلہ بیان خطیب ونقیب

تفاخر محمود گوندل

سے مدیر ارژنگ حسن عباسی کا مکالمہ

عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے جنون میں حمد ونعت میں حدِ فاصل ختم کی جا رہی ہے

س: خاندانی پس منظر بچپن اور تعلیم سے متعلق کچھ بتائیں۔

ج: میں ایک زمیندار گھرانے کا فرد ہوں ہمارے اسلاف ''میانہ گوندل'' ضلع سرگودھا سے جھیورانوالی آ کر آباد ہوئے۔ جٹ گوندل فیملی سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ نسل در نسل حفاظ قرآن اور آئمہ بھی رہے۔ حکیم وخطیب بھی رہے۔ قبلہ والد حاجی نور محمد پرائمری سکول ٹیچر تھے۔ زمیندار ہونے کے ناطے قلیل تنخواہ میں اچھا گذارا ہو جاتا۔ خطیب ہونے کے علاوہ زبردست قوتِ فیصلہ کے حامل تھے۔ آواز میں عجب سوز وگداز تھا۔ نعت سناتے تو وجد طاری ہو جاتا۔ پروفیسر انور مسعود کے ساتھ بڑی دوستی رہی۔ فن خطابت میں عطاء اللہ شاہ بخاری اور شورش کاشمیری سے بہت متاثر تھے۔ میں ایم اے بی ایڈ تک تعلیم حاصل کرنے کے دوران اوسط درجے کا طالب علم رہا لیکن حیرت کی بات ہے کہ اول تا آخر تک مجھے چشمِ عوام الناس حصول تعلیم میں ایک فطین انسان تصور کرتی رہی۔ شاید میری علمی، ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے مجھے ہر مرتبہ بین الاضلاعی تقریری مقابلوں میں اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ 1993ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن سے سبجیکٹ اسپیشلسٹ (اردو) تعینات ہوا اور انٹرمیڈیٹ کلاسز کو اردو پڑھانا شروع کیا۔

س: شاعری کا آغاز کب ہوا؟

ج: غالب کے تلمیذ خاص مولانا الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر وشاعری میں بالکل بجا تحریر کیا ہے کہ یہ وہ لطیف ملکہ ہے جو شاعر ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے دیگر امور کی طرح اسے حاصل کرنے کے لیے محنت ومشقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ سراسر اللہ کی عنایت ہوتی ہے۔ میرے اپنے تجربے کے پیش نظر میرا فیصلہ یہ ہے کہ جو آدمی عہد طفولیت سے ہی یعنی پرائمری ایجوکیشن سے ہی اساتذہ کے اشعار صحیح موسیقیت اور وزن کے ساتھ پڑھ سکتا ہو وہ شاعر بھی بن سکتا ہے۔ میرے پاس شاعری کے بہت سے شوقین اصلاح کے لیے آتے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ غالب، اقبال، میر کے اشعار صحیح وزن اور تلفظ کے ساتھ پڑھ بھی نہیں سکتے لیکن ان کا جنون یہ ہوتا ہے کہ میں صاحب کتاب بن جاؤں۔ چناں چہ اللہ کے فضل وکرم سے، اساتذہ کے اشعار صحیح تلفظ کے ساتھ میں شروع سے ہی پڑھا کرتا تھا اور یہ ذوق مجھے والدہ محترمہ کی طرف سے ودیعت ہوا۔ وہ خود بھی ایک بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ ان کی ایک حمد ونعت کسی دور میں جماعت اسلامی کے رسالے شہاب میں شائع ہوئی جس کے ایڈیٹر کوثر نیازی مرحوم تھے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ زندگی کی پہلی غزل بی اے کے دوران لکھی۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

عہدِ حاضر کے نامور اہلِ قلم کے تاریخی انٹرویوز پر مبنی معرکۃ الآراء کتاب

جس کی تالیف میں ربع صدی کا وقت لگا

100 تخلیق کار

اشاعت کے آخری مراحل میں ہے

معروف ادیب، شاعر، کالم نگار، مدیر اور مترجم **عامر بن علی** کا تاریخی ادبی کارنامہ

اعزاز احمد آذر، شہرت بخاری، احمد عقیل روبی، تبسم کاشمیری، احمد ندیم قاسمی، خالد علیم، اعجاز رضوی، فرحت پروین، اعتبار ساجد، انور مسعود، منو بھائی، اختر شمار، جاوید شاہین، امجد اسلام امجد، منیر نیازی، غلام حسین ساجد، اظہر غوری، فرحت زاہد، خالد مسعود خاں، احمد فراز، مشکور حسین یاد، فاروق طراز، ریحانہ قمر، اسلم کولسری، ڈاکٹر انور سجاد، رخشندہ نوید، راجا رسالو، مشتاق احمد یوسفی، ریاض مجید، فرحت عباس شاہ، بیدل حیدری، فہیم ضیاء، اقبال راہی، محسن بھوپالی، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، اصغر ندیم سید، اعجاز توکل خاں، ناز بٹ، ظفر اقبال، نیلما ناہید درانی، ناصر بشیر، علیم ناصری، بشریٰ اعجاز، اصغر شاد، عطاء الحق قاسمی، جواز جعفری، طاہر، ڈاکٹر علی کمیل قزلباش، آمنہ مفتی، انعام الحق جاوید، حسن عباسی، کیپٹن عطاء محمد خاں، اشفاق احمد، جمشید مسرور، ڈاکٹر حنان عواد، مشتاق صوفی، مستنصر حسین تارڑ، قاسم علی شاہ، بلقیس ریاض، احمد جلیل، ممتاز راشد، ڈاکٹر شہناز مزمل، منشا یاد، انور شعور، سیف اللہ خالد، اسد اللہ غالب، امین کنجاہی، صوفیہ بیدار، ڈاکٹر سلیم اختر، فخر زمان، اشفاق احمد ورک، اسد عباس اسد، علی چوہدری، ڈاکٹر صغریٰ صدف، شہزاد احمد، خالد شریف، وصی شاہ، سلیمان جاذب، ڈاکٹر علی محمد خاں، نوشی گیلانی، طاہر انوار پاشا، یونس احقر، عباس تابش، ڈاکٹر نجیب جمال، راجا نئیر، لبنیٰ صفدر، یاسر پیرزادہ، ڈاکٹر طاہر تونسوی، خورشید مستانہ، ڈاکٹر اشفاق ورک، مولانا اکرم اعوان، گل نوخیز اختر، سلیم طاہر، امجد اقبال امجد، سرفراز سید، دالیاسٹاپانکوٹی، ابرار ندیم، اے۔ جی۔ جوش، قمر رضا شہزاد

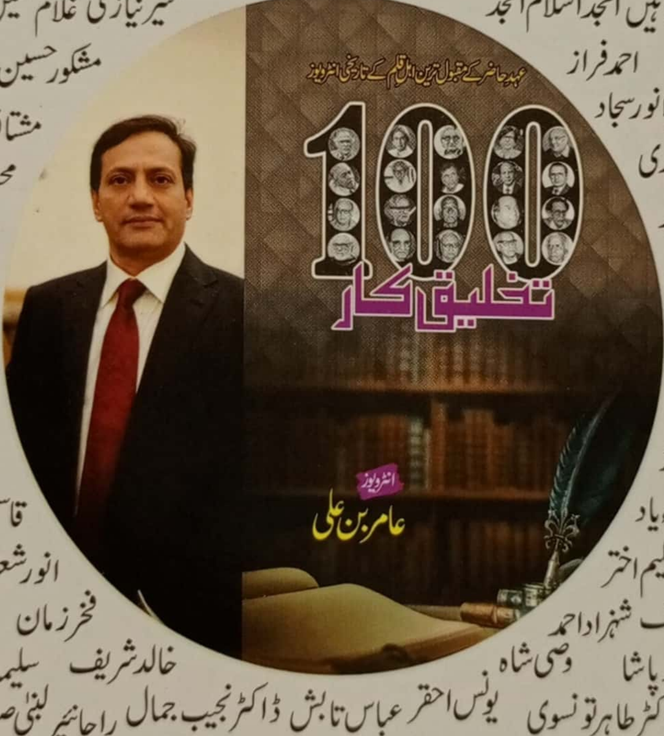

FEEL FREE TO READ ONLINE
www.amirbinali.com

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com